اکادمی
ادبیات
پاکستان

پاکستانی
ادب کے
معمار

ڈاکٹر جمیل جالبی : شخصیت اور فن

عبدالعزیز ساحر

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر جمیل جالبی
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر جمیل جالبی
شخصیت اور فن

عبدالعزیز ساحر

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	:	افتخار عارف
منتظم	:	محمد انور خان
تدوین و طباعت	:	سعیدہ درانی
اسکیچ	:	احمد حبیب
اشاعت	:	2007
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد : -/160 روپے
		پیپر بیک : -/150 روپے

ISBN: 978-969-472-209-2

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معمارانِ ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ہماری قومی اور ادبی تاریخ کا بہت اہم اور انتہائی لائقِ توجہ باب ہیں۔ وہ مورخ ہیں، محقق ہیں، ادیب ہیں، نقاد ہیں، مترجم اور ماہر لسانیات بھی، ایسے اسکالر کہ عالمی سطح پر بھی ان کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ ان کی ساری زندگی جہانِ فکر و دانش کے در و بام تعمیر کرتے، سجاتے گزری اور گزر رہی ہے۔ بلاشبہ اُردو ادب کا تذکرہ ان کے ذکر کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کی علمی و تحقیقی خدمات اور ادبی حوالوں سے یہ کتاب ڈاکٹر جمیل جالبی پر بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

پیشِ نظر کتاب ''ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن'' ملک کے معروف محقق عبدالعزیز ساحر نے بڑی توجہ اور محنت سے تحریر کی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت اور ادبی خدمات کو متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے، سمجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ ''پاکستانی ادب کے معمار'' ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

ڈاکٹر جمیل جالبی معاصر ادبی اور فکری تہذیب کا معتبر نام ہے۔ وہ معروف معنوں میں تخلیق کار نہیں۔ تنقید، تحقیق اور ترجمہ...... یہ تین میدان ہیں، جہاں انھوں نے اپنے فکر و آہنگ کی نادرہ کاری کا ثبوت دیا۔ ان کی تحقیق اور تنقید...... عمومی رنگ و آہنگ سے مرتب اور متشکل نہیں ہوتی، کیوں کہ ان میں وہ تخلیقی رویے موجود رہتے ہیں، جو فکر و فلسفے کی بنیاد اور اساس ہیں۔......لفظ کے حجرے میں بیٹھ کر خیال کا مراقبہ اتنا آسان نہیں ہوتا، لیکن جالبی صاحب نے یہ بھی کیا۔ ان کے ہاں لفظ...... اپنی عام سطح سے اُٹھ کر گنجینۂ معنی کا طلسم کدہ بن جاتا ہے اور خیال جب تخلیق کی بھٹی میں پک کر لفظ کے آنگن میں اُترتا ہے، تو تنقید ایک نئے فکری اور تخلیقی اُسلوب میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ لفظ کو اس کی تہذیبی اور جمالیاتی معنویت کے لبادے میں ملبوس کر کے خیال کی رعنائی احساس کا اظہاریہ بنا دیتے ہیں اور یوں لفظ اور خیال کی اکائی: تہذیب اور ثقافت کے مظاہر کی ترجمان بن جاتی ہے۔ لفظ: خیال کی ترسیل اور ابلاغ کا ذریعہ بھی ہے اور گنجینۂ معنی کا طلسم کدہ بھی...... اور خیال: شعور کے آنگن میں ایک بے معنی لہریہ بھی ہے اور احساس کا استعارہ بھی۔ جب خیال: احساس کی استعاراتی حیثیت کو اوڑھ کر، لفظ کے پیکر میں ڈھل جائے، تو پھر اس کی رعنائی زمانوں پر محیط ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر جالبی کے ہاں خیال: لفظ کی اوٹ سے ایسے منظر نامے تشکیل دیتا ہے کہ نظامِ فکر و فرہنگ کے دریچے لو دے اٹھتے ہیں۔ ان کی تنقید: فکری رویوں سے عبارت ہوتی ہے اور ان کا اسلوب: تخلیقی اور جمالیاتی آہنگِ تنقید کو ایسا فکری زاویہ عطا کرتا ہے کہ ان کی تنقید......تنقیدی روایت کے عمومی رجحانات سے بالکل ہٹ کر منفرد حیثیت کی حامل بن جاتی ہے۔ اسی طرح ان کا تحقیقی آہنگ: تنقیدی شعور کے باعث رعنائی احساس کا آئینہ دار بن جاتا ہے اور حقائق کی تلاش ریاضیاتی گوشواروں کی پابند نہیں رہتی،

بل کہ وہ تہذیب اور تاریخ کے اس تصورِ حقیقت سے رنگ کشید کرتی ہے، جو ہند اسلامی تہذیب کی بنیاد ہے۔ اس میں تخلیقی اظہار کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور جمالیات کی رنگینی بھی اور یہی رنگینی اور چاشنی ان کے اُسلوب کی پہچان بھی سمجھی جاتی ہے، کیوں کہ ان کا اُسلوبِ نگارش اپنی سادگی میں رعنائی کی رنگارنگی کا اشاریہ بھی ہے اور پُرکاری میں توانائی اور تازگی کا اظہاریہ بھی!

عبدالعزیز ساحر

ڈاکٹر جمیل جالبی: سوانحی خاکہ

نام

محمد جمیل خاں بن محمد ابراہیم خاں بن محمد اسمٰعیل خاں یوسف زئی

قلمی نام

جمیل جالبی/ڈاکٹر جمیل جالبی

''جس زمانے میں جالبی صاحب فرسٹ ایر کے طالب علم تھے، تو انھوں نے اپنا نام جمیل جالبی کر لیا۔ نام کے ساتھ جالبی کا لاحقہ اس لیے لگایا گیا کہ اردو کے صفِ اول کے صحافی سید جالب دہلوی اور جمیل جالبی کے دادا، دونوں ہم زلف بھی تھے اور رشتے کے بھائی بھی تھے۔ ان کی غیر معمولی شہرت کی وجہ سے گھر میں ان کا اکثر ذکر رہتا۔ محمد جمیل خاں نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا، تو ان کا آئیڈیل سیّد جالب دہلوی تھے، اس لیے جالب کی رعایت سے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ جالبی لگا لیا۔'' [۱]

آبائی وطن

سوات

''میرے جدِ امجد برسوں پہلے سوات کے کسی گاؤں یا علاقے سیداں سے ہندوستان آئے تھے اور گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے''۔ [۲]

ننھیال

''میرے نانا مرزا احمد بیگ انجینئر تھے۔ انھوں نے شاہ ولی اللہ کے فارسی مکاتیب مرتب کر کے سہارن پور سے شائع کرائے۔'' [۳]

تاریخِ پیدائش

۱۲جون۱۹۲۹ءعلی گڑھ
سرکاری کاغذات میں تاریخِ پیدائش یکم جولائی درج ہے۔اسی طرح سہ ماہی ارمغان، کراچی میں مقامِ پیدائش سہارن پور لکھا گیا ہے [ص:۶] ، یہ دونوں اندراج درست نہیں۔ [۴]

تعلیم

میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول سہارن پور سے ۱۹۴۳ء میں کیا۔[۵]
۱۹۴۵ء میں میرٹھ کالج سے ایف اے کیا۔[۶]
۱۹۴۷ء میں میرٹھ کالج سے بی اے کیا۔[۷]
۱۹۴۹ء میں انگریزی میں ایم اے سندھ یونی ورسٹی کراچی سے کیا۔[۸]
۱۹۵۰ء میں ایم اے اردو سندھ یونی ورسٹی، کراچی سے کیا۔[۹]
۱۹۵۰ء میں سندھ یونی ورسٹی، کراچی سے ایل ایل بی کیا۔[۱۰]
۱۹۷۱ء میں سندھ یونی ورسٹی جامشورو رحیدر آباد سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کیا۔[۱۱]
۱۹۷۳ء میں سندھ یونی ورسٹی جامشورو سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ یہ ڈگری حاصل کرنے والے پہلے اور آخری امیدوار تھے۔[۱۲]
۱۹۸۸ء میں اعزازی ڈگری: ڈی ایس سی [Medicina Alternatua International][۱۳]

اساتذہ

ولی محمد خاں شعلہ	پروفیسر مکرجی
مولوی محمد اسمٰعیل	پروفیسر کرار حسین
مولوی فیض الحسن	پروفیسر غیور احمد رزمی صدیقی
پروفیسر مظہری	پروفیسر محمد حسن عسکری
پروفیسر بسواس	ڈاکٹر شوکت سبزواری
پروفیسر ماتھر	پروفیسر حبیب اللہ غضنفر [۱۴]

ملازمت

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک بہادر یار جنگ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔[۱۵]
۱۹۵۳ء میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے انکم ٹیکس افسر مقرر ہوئے اور انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔[۱۶]
یکم ستمبر ۱۹۸۳ء سے ۳۱ اگست ۱۹۸۷ء تک جامعہ کراچی میں وائس چانسلر رہے۔[۱۷]
۱۷ نومبر ۱۹۸۷ء سے نومبر ۱۹۹۴ء تک مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے صدر نشین رہے۔[۱۸] اور اسی کے ساتھ ۱۹۹۱ء ...... ۱۹۹۸ء تک اردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے اعزازی صدر بھی رہے۔

شادی

یکم نومبر ۱۹۵۳ء کو خالہ زاد نسیم شاہین سے شادی ہوئی۔[۱۹]

اولاد

۱) ڈاکٹر خاور جمیل
۲) محمد علی خاں
۳) سمیرا جمیل
۴) فرح جمیل

اعزازات

داؤد ادبی انعام: ۱۹۶۴ء [پاکستانی کلچر]
داؤد ادبی انعام: ۱۹۷۳ء [مثنوی کدم راؤ پدم راؤ]
داؤد ادبی انعام: ۱۹۷۴ء [قدیم اردو کی لغت]
داؤد ادبی انعام: ۱۹۷۵ء [تاریخ ادبِ اردو]

یونی ورسٹی گولڈ میڈل: ۱۹۸۷ء

محمد طفیل ادبی ایوارڈ: ۱۹۸۹ء

ستارۂ امتیاز، حکومتِ پاکستان: ۱۹۹۰ء

ہلالِ امتیاز، حکومتِ پاکستان: ۱۹۹۴ء

اولین نگارشات

پہلا ڈراما: سکندر اور ڈاکو [۱۹۴۱ء میں اسکول کے اسٹیج پر کھیلا گیا۔]

''میں نے سب سے پہلے نویں جماعت میں ایک چھوٹا سا ڈراما لکھا تھا، اس کے بعد میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھتا رہا۔ جب کالج میں پہنچا، تو افسانے لکھنے شروع کیے، کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی منٹو کے انداز میں اور کبھی عصمت چغتائی اور حسن عسکری کے رنگ میں۔'' [۲۰]

پہلا مضمون

[نئے شاعر..... فیض احمد فیض [مطبوعہ نیا دور، کراچی: اگست ۱۹۴۸ء]

''۱۹۴۷ء میں جب سہارن پور میں ہندو مسلم فساد ہو رہا تھا، کرفیو لگا ہوا تھا اور ہم سب گھروں میں قید تھے، تو اس وقت میرے پاس چند کتابیں تھیں۔ ان میں فیض احمد فیض کی نقشِ فریادی بھی تھی۔ نقشِ فریادی اس زمانے میں میرا پسندیدہ مجموعہ تھا۔ میں اسے پڑھتا رہتا اور لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اسے پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ فیض کی شاعری کے بارے میں کچھ لکھنا چاہیے۔ یہ میرا پہلا تنقیدی مضمون تھا، جو میں نے لکھا۔ جب میں کراچی آیا، تو یہ مسودہ میرے ساتھ تھا۔ صمد شاہین اور ممتاز شیریں کا نیا دور نکل رہا تھا۔ میں نے مضمون شاہین صاحب کو دے دیا، جسے انھوں نے نیا دور میں شائع کیا۔'' [۲۱]

پہلا ترجمہ

جانورستان: مطبوعہ ۱۹۵۸ء

پہلی مرتبہ کتاب

حاجی بغلول: مطبوعہ ۱۹۶۱ء

پہلی کتاب

پاکستانی کلچر ...... قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ: مطبوعہ ۱۹۶۴ء

ادارت

نائب مدیر: ۱۹۴۹ء ہفت روزہ پیامِ مشرق، کراچی [چھ مہینے کے لیے]
۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک ساقی، کراچی کی مجلسِ ادارت میں شامل رہے اور اس میں باتیں کے عنوان سے ادبی کالم نگاری بھی کی۔
۱۹۵۵ء میں اپنا رسالہ نیا دور نکالا ...... بہ قولِ نذرالحسن صدیقی:
''۱۹۵۵ء میں لاہور میں ایک بک اسٹال سے ایک نیا ادبی جریدہ خریدا تھا، جس کے دیدہ زیب ٹائٹل، اعلیٰ پائے کے ادبی وشعری معیار اور اچھوتے انداز نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہ نیا دور کا پہلا شمارہ تھا۔ صفحۂ ادارت پر تو شمیم احمد اور شاہد قمر سلطانہ کا نام چھپا ہوا تھا، مگر جب ۱۹۵۷ء میں مستقل طور پر کراچی آ گیا، تو میاں بھائی کے ذریعے ہی معلوم ہوا کہ نیا دور جمیل جالبی کا پرچہ ہے اور اپنے پرچے میں چھپنے والی سطر سطر پہلے ان کی نظر سے گزرتی ہے۔ .... آنے والے بعد کے سالوں میں خود مجھے بھی ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہو گیا اور صدیقی صاحب کی بات کی تصدیق ہو گئی۔'' [۲۲]
''نیا دور اردو کا غالباً واحد ادبی رسالہ ہے، جس کے اصل مدیر کا نام کبھی اس پر لکھا نظر نہیں آیا، لیکن اس کے باوجود تمام اہلِ قلم جانتے تھے کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کون ہے؟'' [۲۳]

ڈاکٹر جمیل جالبی: فن اور شخصیت کے حوالے سے لکھی گئی کتابیں

۱) ڈاکٹر جمیل جالبی ...... سوانحی کتابیات: مرتبہ نسیم فاطمہ: ۱۹۹۸ء

۲) ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی: ۱۹۹۳ء
۳) ڈاکٹر جمیل جالبی ...... سوانحی کتابیات مرتبہ ڈاکٹر نسیم فاطمہ باشتراک سعید احمد: ۱۹۹۶ء
۴) سہ ماہی ارمغان، کراچی [جمیل جالبی نمبر]: اپریل مئی جون ۱۹۹۶ء
۵) سہ ماہی سفیرِ اردو، لیوٹن [جمیل جالبی نمبر]: اکتوبر نومبر دسمبر ۲۰۰۴ء
۶) ڈاکٹر جمیل جالبی ...... شخصیت اور فن: عبدالعزیز ساحر: ۲۰۰۷ء

آثار

۱۔ جانور ستان [جارج آرول کے ناول Animal Farm کا اردو ترجمہ]: کراچی، مکتبۂ نیا دور: ۱۹۵۸ء

۲۔ ایلیٹ کے مضامین [نو مضامین کا ترجمہ]: کراچی، اردو اکیڈمی سندھ: ۱۹۶۰ء/ لکھنؤ، محبوب خاں پبلشر: س ن/ [۱۴ مضامین پر مشتمل نظر ثانی شدہ ایڈیشن]، کراچی، رائٹرز بک کلب: ۱۹۷۱ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۷۸ء/ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز: ۱۹۹۱ء

۳۔ حاجی بغلول [منشی سجاد حسین]: کراچی، مشتاق بک ڈپو: ۱۹۶۱ء

۴۔ پاکستانی کلچر ...... قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ: کراچی، مشتاق بک ڈپو: ۱۹۶۴ء/ ۱۹۶۶ء/ کراچی، الیٹ پبلشرز: ۱۹۷۳ء/ اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن: ۱۹۸۱ء/ ۱۹۸۴ء/ ۱۹۸۵ء/ ۱۹۸۷ء/ ۱۹۹۲ء [Pakistan - The Indentity of Culture کے عنوان سے ہادی حسین نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ حوالے کے لیے دیکھیے: کراچی، رائل بک کمپنی: ۱۹۸۴ء/ دہلی، الفا اینڈ الفا: ۱۹۸۶ء/ سندھی میں ترجمہ ڈاکٹر ایاز قادری نے کیا، جو مکتبۂ اسحاقیہ، کراچی کے اہتمام سے ۱۹۸۷ء میں چھپا۔]

۵۔ تنقید اور تجربہ: کراچی، مشتاق بک ڈپو: ۱۹۶۷ء/ لاہور، یونیورسل بکس: ۱۹۸۸ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۸۹ء

۶۔ بزمِ خوش نفساں [شاہد احمد دہلوی کے ۲۶ خاکوں کا مجموعہ]: کراچی، مکتبۂ اسلوب: ۱۹۸۵ء

۷۔ دیوانِ حسن شوقی: کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: ۱۹۷۱ء

۸۔ دیوانِ نصرتی: لاہور، قوسین: ۱۹۷۲ء [کتابی صورت میں چھپنے سے قبل یہ دیوان صحیفہ لاہور کے شمارے اکتوبر ۱۹۷۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔]

۹۔ قدیم اردو کی لغت: لاہور، مرکزی اردو بورڈ: ۱۹۷۳ء/ لاہور، اردو سائنس بورڈ: ۱۹۸۸ء

۱۰۔ مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ: کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: ۱۹۷۳ء/دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۱۱۔ ارسطو سے ایلیٹ تک: کراچی، نیشنل بک فاؤنڈیشن: ۱۹۷۵ء/ اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن: ۱۹۷۶ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۷۷ء/ اسلام آباد: ۱۹۸۴ء/ اسلام آباد: ۱۹۸۸ء/ دہلی: ۱۹۹۳ء/ اسلام آباد: ۱۹۹۳ء/ ۱۹۹۷ء/ ۲۰۰۳ء

۱۲۔ تاریخ ادبِ اردو [جلد اول]: لاہور، مجلسِ ترقی ادب: ۱۹۷۵ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۷۷ء/ لاہور: ۱۹۸۶ء/ لاہور: ۱۹۸۷ء/ دہلی: ۱۹۸۹ء/ دہلی: ۱۹۹۳ء

۱۳۔ محمد تقی میر: کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: ۱۹۸۱ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۸۳ء/ دہلی: ۱۹۹۰ء/ کراچی ۱۹۹۲ء

۱۴۔ حیرت ناک کہانیاں: کراچی، نیشنل بک فاؤنڈیشن: ۱۹۸۳ء/ اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۸ء [ڈاکٹر ایاز قادری نے حیرت ناک کہانیوں کے عنوان سے اس کا ترجمہ کیا، جو ۱۹۸۵ء میں مکتبۂ اسحاقیہ، کراچی کے اہتمام سے چھپا۔]

۱۵۔ تاریخ ادبِ اردو [جلد دوم ..... حصہ اول]: لاہور، مجلسِ ترقی ادب: ۱۹۸۴ء/ دہلی، ایجوکیشنل: پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۸۵ء/ دہلی: ۱۹۸۹ء/ دہلی: ۱۹۹۳ء

۱۶۔ تاریخ ادبِ اردو [جلد دوم ..... حصہ دوم]: لاہور، مجلسِ ترقی ادب: ۱۹۸۴ء [دونوں جلدوں کی یک جا اشاعت کے لیے دیکھیے: لاہور: ۱۹۸۷ء/ دہلی: ۱۹۸۵ء/ دہلی: ۱۹۹۳ء]

۱۷۔ نئی تنقید مرتبہ خاور جمیل: کراچی، رائل بک کمپنی: ۱۹۸۵ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۱۸۔ Pakistani Culture [بہ اشتراک ایم ایچ صدیقی] اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن: ۱۹۸۶ء

۱۹۔ The Changing world of Islam [بہ اشتراک قاضی اے قادر]: کراچی، بی سی سی ٹی، کراچی یونی ورسٹی: ۱۹۸۶ء

۲۰۔ ن م راشد ..... ایک مطالعہ: کراچی، مکتبۂ اسلوب: ۱۹۸۶ء

۲۱۔ ادب، کلچر اور مسائل مرتبہ خاور جمیل: کراچی، رائل بک کمپنی: ۱۹۸۶ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۲۲۔ کلیاتِ میراجی: لندن، اردو مرکز: ۱۹۸۸ء/ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز: ۱۹۹۶ء

۲۳۔ قومی زبان ...... یک جہتی، نفاذ اور مسائل: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: ۱۹۸۹ء

۲۴۔ برِصغیر میں اسلامی جدیدیت [عزیز احمد کی کتاب Islamic Modernism in India and Pakistan: 1857-1964 کا اردو ترجمہ]: لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ: ۱۹۸۹ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۹۰ء [دہلی سے یہ کتاب ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت کے عنوان سے شائع ہوئی۔]

۲۵۔ میرا جی ...... ایک مطالعہ: لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز: ۱۹۹۰ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۹۲ء

۲۶۔ قلندر بخش جرأت ...... لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ: ۱۹۹۰ء

۲۷۔ برِصغیر میں اسلامی کلچر [عزیز احمد کی کتاب Islamic Culture کا اردو ترجمہ]: لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ: ۱۹۹۰ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۹۱ء [دہلی سے یہ کتاب ہندو پاک میں اسلامی کلچر کے عنوان سے چھپی۔]

۲۸۔ فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ [جلد اول]: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: ۱۹۹۱ء

۲۹۔ معاصر ادب: لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز: ۱۹۹۱ء

۳۰۔ قومی انگریزی اردو لغت: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: ۱۹۹۲ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۹۳ء [دو جلدوں میں]/ اسلام آباد: ۱۹۹۴ء/ ۱۹۹۶ء/ ۱۹۹۹ء/ ۲۰۰۲ء

۳۱۔ فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ [جلد دوم]: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: ۱۹۹۳ء

۳۲۔ پاکستان میں ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ [پمفلٹ]: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: ۱۹۹۳ء

۳۳۔ نہ ہوئی قرولی: لاہور، فیروز سنز: ۱۹۹۳ء [سرشار کے مزاحیہ کردار خوجی کی سرگزشت پر مبنی کہانی، جو کامل القادری کے اشتراک سے ماہنامہ ہونہار، کراچی میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔]/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۳۴۔ ادبی تحقیق: لاہور، مجلسِ ترقی ادب: ۱۹۹۴ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۳۵۔ بوطیقا: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: ۱۹۹۸ء/ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۹۹ء

۳۶۔ بارہ کہانیاں: راول پنڈی، رباب پبلشرز: ۲۰۰۴ء/ راول پنڈی: ۲۰۰۶ء

۳۷۔ تاریخِ ادبِ اردو [جلد سوم]: لاہور، مجلسِ ترقی ادب: ۲۰۰۶ء

شخصیت

تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

''۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ ایک دن شام کے وقت میرے بڑے بھائی اور کچھ دوستوں کے ہمراہ ایک لڑکا ہمارے گھر آیا: چھریرا، لیکن قدرے دبلا بدن، دبلے پن کی وجہ سے رخساروں کی ہڈیاں ذرا سی ابھری ہوئیں؛ گورا چٹا رنگ؛ تیزی سے حرکت کرتی ہوئی بڑی بڑی روشن آنکھیں؛ سیاہی مائل گھنے سنہرے بال؛ تن وتوش کے مقابلے میں قدرے بھاری آواز؛ مسیں خاصی بھیگی ہوئیں اور روشن گالوں پر نکلتا ہوا خط؛ مسکراتے ہوئے ہونٹ؛ نہایت چلبلا اور بے چین؛ باتوں میں اعتماد؛ بڑے پائنچوں کا پاجامہ؛ جسم پر شیروانی، جس کے سب بٹن لگے ہوئے تھے؛ پیر میں سلیم شاہی جوتا......'' [۲۴]

''ایک دن دونوں وقت ملتے ایک بڑے ریشمین سے نوجوان سامنے آ کھڑے ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ انھوں نے سلام کیا۔ میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پر سفید کشتی نما ٹوپی؛ گول چہرہ؛ یاسمینی رنگ؛ کشادہ پیشانی؛ غلافی آنکھیں؛ کتاراسی ناک: پتلے پتلے گلابی ہونٹ؛ ٹھوڑی میں ہلکا سا چاہِ زنخدان؛ ڈاڑھی مونچھ صاف؛ سفید سلک کی شیروانی؛ اکبرا پاجامہ اور پاؤں میں سفید سانبھر کی جوتی۔'' [۲۵]

''جمیل خان کو میں نے اب سے تیس برس پہلے اس وقت دیکھا، جب وہ ایک جوانِ سبزہ آغاز تھے۔ عمر تقریباً اتنی ہی رہی ہوگی، جتنی اب ماشاء اللہ ان کے بیٹے کی ہے۔ لمبائی میں تب بھی اتنے ہی تھے، چوڑائی میں بہر کیف پہلے سے دوگنے نہیں، تو ڈیڑھ گنے ضرور ہو گئے ہیں۔ خوش حالی اور فارغ البالی کی علامات

اگر پہلے موجود بھی تھیں، تو کم از کم سر سے ظاہر نہیں ہوتی تھیں۔ میٹھے اور بھولے پہلے بھی اتنے ہی تھے۔ جہاں تک مجموعی شخصیت اور کردار کا تعلق ہے، تو یوں سمجھیے کہ شراب کہنہ کی طرح پختہ تو ہو گئے ہیں، بدلے بالکل نہیں ہیں۔ یہ بات کہ مجھے جمیل خاں سے محبت ہے، کہنے کی بات نہیں ہے۔ کہنے کی یہ بات ہے کہ جو شخص ان کو جانتا ہے، وہ ان سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جمیل خاں صرف محبت کرانا ہی نہیں جانتے، محبت کرنا بھی جانتے ہیں۔ جمیل خاں سے میں اپنے تعلق کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں، تو یہ ایک گہرے اعتماد کا تعلق ہے۔ ایک ایسا اعتماد، جسے تہائی صدی کی طویل رفاقت کی کسوٹی پر پرکھا جا چکا ہے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا ہو، جب میں نے جمیل خاں سے ایسا قرب محسوس نہ کیا ہو، جیسے وہ میرے ہی وجود کا ایک حصہ ہیں، یا میں ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو، جس کے تخریبی عنصر کو کم کر کے جمیل خاں نے اپنی ذات سے ہم آہنگ بنا لیا ہے۔ بہت سے تعلقات تند و تیز بارشوں کی طرح ہیجان پرور اور شدید ہوتے ہیں۔ پانی جس طرح برستا ہے، اسی طرح بہہ جاتا ہے، لیکن تعلق کی ایک شکل وہ بھی ہوتی ہے، جب بارش آہستہ، مگر مستقل ہو۔ رم جھم کی سی ایک کیفیت جو اپنی نرمی کے اثرات سے زمین کے روئیں روئیں کو سیراب کر دیتی ہے۔ جمیل خاں سے یوں محبت اور رفاقت ایک ایسی ہی بارش کی طرح روح کی سیرابی کا نام ہے۔ ان کی شخصیت کا ایک مخصوص پہلو ان کا دھیما پن ہے۔ ایک ایسا دھیما پن، جس کے پیچھے کم زوری کا نہیں، قوت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے مزاج میں ایک ایسا تحمل، بردباری اور توازن ہے، جو میں نے ادب سے تعلق رکھنے والے بہت کم لوگوں میں پایا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کی ادبی اور سماجی شخصیت میں جو توانائی اور استحکام پایا جاتا ہے، وہ ان کے اسی توازن کی دین ہے۔" [۲۶]

"جمیل جالبی وضع دار اور محبت و مروت والے بڑے بھلے آدمی ہیں۔ خیر بھلے آدمی تو اور بھی بہت سے ہیں اور بھلے آدمی کا صرف اور محض بھلا ہونا تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر آدمی حالی ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا شبلی بھی ہو اور اکبر

الہ آبادی میں تھوڑے سے سرسید احمد خاں اور ملا دیے جائیں، تو شکل ہی کچھ اور نکل آتی ہے۔ آج کل ضرورت بھی ایسے آدمیوں کی ہے، جو نہ تو آدھا پونا آدمی ہو اور نہ اپنے سے پہلے کے، کسی آدمی کی کاربن کاپی ہی ہو، تو جمیل جالبی اس قسم کے بھلے آدمی نہیں ہیں۔ وہ ذہین آدمی ہیں؛ باشعور آدمی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ پیارے آدمی بھی ہیں۔" [۲۷]

"جمیل دل کا صاف، زبان کا کھرا اور صاف گو انسان ہے۔ کسی کو دھوکا نہیں دے گا؛ کسی سے دشمنی نہیں نکالے گا؛ کسی سے بدلہ یا انتقام نہیں لے گا۔ معاف کرنا اس کا مسلک ہے، کوئی اس کے ساتھ برائی کرے، تو وہ بھول جاتا ہے۔ وہ کھلے دشمنوں سے بھی دشمنی نہیں کرتا۔ تعصب اس کے مزاج میں بالکل نہیں ہے۔ ضرورت مند کوئی ہو، کہیں کا ہو، وہ اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بیسیوں طالب علم ایسے ہیں، جنھیں جمیل نے اپنے خرچ سے تعلیم اور اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے۔ وہ ایک دردمند و مخلص انسان ہے۔ دوسروں کی تکلیف اور دکھ پر بے چین ہو جاتا ہے۔ مروت اس کی فطرت ہے؛ محبت اس کا مسلک ہے۔" [۲۸]

"لکھتے ہوئے قہوہ بار بار پیتے ہیں اور یہی حال پان کھانے کا ہے۔ سگریٹ وغیرہ کے بالکل شوقین نہیں ہیں۔ کھانے میں تیتر کا گوشت بہت پسند کرتے ہیں اور سویٹ ڈش بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ کرتا اور شیروانی اور چپل پہننا انھیں اچھا لگتا ہے۔ ان کی پسند رنگوں کے معاملے میں بدلتی رہتی ہے۔ پھولوں اور خوشبو سے بھی بہت پیار ہے۔ پھولوں میں گلاب کا پھول انھیں پسند ہے۔" [۲۹]

"آج جب کہ وقت جمیل جالبی کے چہرے سے اپنا خراج وصول کرنے پر اصرار کر رہا ہے اور سوچ اور فکر نے ان کے بڑھتے ہوئے سیاہ بالوں کی بھینٹ لے لی ہے، ان کے زیرِ لب تبسم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی تیز رفتاری؛ وہی پانوں کی خوب صورت ڈبیا؛ وہی چھالیا اور زردے

کا سرخ ریشمی بٹوا؛ وہی نرم نرم باتیں۔

ایک شخص نے کہا: ڈاکٹر جمیل جالبی کنجوس ہیں۔ وہ کھل کر کسی کی تعریف نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا: ڈاکٹر جمیل جالبی ایک محتاط انسان ہیں۔ سردیوں کی دھوپ میں چین سے بیٹھ کر سوچتے ہیں؛ موسمِ بہار میں، پھولوں کی خوش بو اکٹھی کر کے لفظوں میں ملاتے ہیں اور پھر وہ سوغات ایک عالم کو بانٹ دیتے ہیں، تا کہ انسان زندہ رہے اور کائنات کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا رہے۔'' [۳۰]

ادب، کلچر اور تنقید کی خوشبو

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد، مشرق کی تہذیبی اقدار کی زوال پذیری اور مغرب کی تہذیبی اقدار کے فروغ سے فکر و فرہنگ کا وہ نیا سلسلہ آغاز ہوا، جس کے اثرات آج بھی ہماری تہذیبی، معاشرتی اور ادبی زندگی کے مختلف شعبوں میں نفوذ کیے ہوئے ہیں۔ مشرقی نظامِ اقدار کی شکست و ریخت سے ہند اسلامی تہذیب کی فکری اور معنوی وحدت، نہ صرف ٹکڑوں میں بٹ گئی، بل کہ انسانی معاشرے پر اس تہذیب کی گرفت باقی نہ رہی اور یوں مشرق کا یہ تہذیبی اندازِ زیست اور طرزِ احساس اپنی فکری اور جمالیاتی بنیادوں پر استوار نہ رہا۔ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح، ہمارا فکری نظام بھی فنونِ لطیفہ کے مجموعی جمالیاتی تناظر میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شاعری، موسیقی [سماع اور دھمال] اور کلچر کی فکری اور معنوی بنیادیں اس تہذیب کے مدار میں گردش کُناں نہ رہیں، جس پر صدیوں سے ان کا سلسلہ متحرک چلا آ رہا تھا۔ اصلاح کے نام پر، ادب اور شاعری پر پہلی ضرب مولانا الطاف حسین حالی [م: ۱۹۱۴ء] نے لگائی، جنھوں نے **مقدمۂ شعر و شاعری** میں ہند اسلامی تہذیب کی نمایندہ صنفِ سخن 'غزل' کے مفاہیم اور موضوعات کو اپنے اصلاح پسندانہ نقطۂ نظر کی بھینٹ چڑھایا۔ انھوں نے ادب و شعر کو افادی طرزِ احساس کا رنگ دے کر اس کی روحانی اپیل کو متاثر کیا۔ عشق جو اسلامی روایت اور تہذیب کا بنیادی اور اساسی نکتہ تھا، اس کی اس قدر عامیانہ تعبیر اور تفسیر کی گئی کہ ہند اسلامی تہذیب کا بنیادی ڈھانچا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا:

اے عشق! تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا، اس کو بٹھا کے چھوڑا

جب افادی نقطۂ نظر نے روحانی نقطۂ نظر کو متاثر کیا، تو مصلحت کیشی نے ہماری تہذیبی زندگی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ مشرق کے پروردہ پیرویٔ مغرب کا درس دینے لگے۔ انھوں نے حالات اور واقعات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، جرأت مندانہ طرزِ زندگی کو اپنانے کے بہ جائے، ہمیں ہوا کے رُخ کو دیکھ کر چلنے کی تلقین کی:

یہ وہ اندازِ نظر تھا، جس نے ہمارے تہذیبی سرمائے کو بے کار بتانے اور ہمیں مغربی افکار سے مرعوب کرنے کا آغاز کیا۔ خشتِ اوّل کی کجی سے فنِ تعمیر کا نتیجہ معلوم! سو ہمارا ادب اور تنقیدی نظام اپنے تہذیبی مدار سے نکل کر، پیرویٔ مغرب کے رنگ میں رنگے گئے۔ بہ قولِ ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''مولانا حالی سے لے کر اب تک نہ صرف ہم اپنے ادب، بل کہ پوری زندگی کو مغرب کے اصولوں اور پیمانوں سے ناپتے اور اپنی روایت، اپنے کلچر اور تہذیبی روح کو نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ اب ہمیں، عہدِ حاضر کے تعلق سے، اسے دوبارہ دریافت کرنا چاہیے، تا کہ تہذیبی روح کو دوبارہ پہچان کر اپنی تخلیقی و فکری قوتوں کو نیا آزاد راستہ دکھا سکیں۔'' [۳۱]

بیسویں صدی میں جب سائنسی رویے فلسفیانہ نظامِ اقدار پر غالب آئے، تو ادب اور فلسفہ ایک ایسے فکری بحران کا شکار ہو کر رہ گئے کہ معاشرتی زندگی میں فرد اور اس کے مابعد الطبیعیاتی رشتے سوالیہ نشان بن گئے۔ انسان ایک ایسے فکری اور تہذیبی بحران کا اسیر ہو گیا، جس نے اس کے جمالیاتی آہنگ کو بُری طرح متاثر کیا۔ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے باہمی ٹکراؤ اور [کسی حد تک] مکالماتی اسلوب نے زندگی کو ایک نیا رنگ ڈھنگ عطا کیا۔ اس اسلوب کی فکری اور جمالیاتی تہذیب محض ادب آشنائی سے ممکن نہیں رہی، جب تک کہ ادب اور اس کے تناظر میں موجود، روایت اور تصورِ حقیقت کی وہ کلّی تفہیم ممکن نہ ہو جائے، جو ادب کو فکری اور تہذیبی بنیادوں پر استوار کرتی ہے۔ ادب اپنے سماج کے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ اس میں معاشرتی زندگی کے سارے رنگ رس، خواہ وہ مادی ہوں یا روحانی؛ فکری ہوں یا جمالیاتی؛ معاشی ہوں یا نفسیاتی...... گھل مل کر، اس طرح باہم آمیخت ہو جاتے ہیں کہ ان میں دوئی کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ ادب کا یہ فکری آہنگ ایک ایسی اکائی کی تخلیق کرتا ہے، جو معاشرے کے ثقافتی رویوں کو ٹکڑوں میں بانٹنے کے بہ جائے، انھیں کلیت کی صورت میں مرتب کرتا ہے اور اگر ادب اس فکری آہنگ کو مرتب نہ کر سکے، تو پھر تہذیبی بحران: تخلیقی وجدان اور عرفان کو متاثر کرتا ہے اور یوں ادب میں تہذیبی اور ثقافتی رویے اپنے مجموعی تناظر میں استوار نہیں ہو پاتے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں:

> ''تخلیقی و فکری عمل کی اسی دریافتِ نو سے ہمارے ہاں نئے اور بڑے تخلیقی و تہذیبی دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔ تنقید ہمیشہ سے یہی کام کرتی آئی ہے۔ اس وقت ادب کے بحران کا بنیادی سبب بھی یہی ہے کہ تنقید نے اپنا یہ کام بند کر دیا ہے۔

نہ صرف تنقید نے، بل کہ تخلیقی کام کرنے والوں نے بھی یہ کام چھوڑ دیا ہے اور خود کو اپنی ذات کے نہاں خانے میں قید کر کے بھول گئے ہیں کہ دورِ حاضر کے حوالے سے اپنی تہذیب کا عرفان: تخلیقی روح کو پروان چڑھاتا اور صحت عطا کرتا ہے۔ اس صورتِ حال کا شعور ہی ہماری نئی تخلیقی و فکری زندگی کا ضامن ہے اور اسی شعور سے امتزاج کا عمل وجود میں آئے گا اور اسی امتزاج سے ہمارا ادب بحران سے نکل کر نئے اور بڑے تخلیقی دور میں داخل ہوگا۔۔۔۔۔ یہ میرا ایقان ہے۔" [۳۲]

ادب: انسانی زندگی اور تہذیبی مظاہر کی ترجمانی سے عبارت ہے۔ اگر انسانی زندگی اپنے تہذیبی اور فکری مدار سے ہٹ جائے، تو ادب بے معنویت کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس بحرانی کیفیت میں نہ تو وجدانی آہنگ مرتب ہو سکتا ہے اور نہ ہی مکاشفاتی رویے۔۔۔۔۔ وجدان اور مکاشفے کا تعلق چوں کہ تہذیب کے اس روحانی نظام کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، جو فرد کے تجربے سے پھوٹتا ہے، اس لیے اس تجربے کی تخلیقی معنویت کے ادراک اور آگاہی کے لیے ضروری ہے کہ وہ فرد اپنی تہذیبی روایت سے فکری اور معنوی اعتبار سے جڑا ہوا ہو، کیوں کہ اس کا تعلق تہذیب کے عناصرِ ترکیبی کے ساتھ جس قدر مضبوط ہوگا، اسی قدر اس کا مشاہدہ اور تجربہ جمالیاتی گہرائی اور گیرائی سے مملو ہوگا۔ اگر اس کے تجربے میں، تہذیبی رویے کی عکاسی اپنے پورے فکری نظام کے ساتھ متشکل ہو گی، تو اس کا تجربہ اپنے اندر وجدانی اور مکاشفاتی رویے کی بوباس سمیٹ لے گا۔ بہ صورتِ دیگر انسانی زندگی اپنے بے معنی اور لایعنی رویوں کی بدولت ایک ایسے نظامِ فکر کی تشکیل کرے گی، جو نہ تو تہذیب شناسی میں معاون ہوگا اور نہ ہی عصری حسیت کی عکس گری میں۔۔۔۔۔ اور جب ادب اور زندگی میں اس طرح کی صورتِ حال وقوع پذیر ہو جائے، تو پھر کلچر کی شناخت اپنے فکری اور جمالیاتی تناظر میں ممکن نہیں رہتی، کیوں کہ تہذیب اپنے بطون میں معنی کا گنجینہ ہوتی ہے۔ اس کا خارجی اور باطنی نظام تصورِ حقیقت سے روشنی کشید کرتا رہتا ہے، مگر جب ادب اور زندگی کا منظر نامہ اپنے تہذیبی مرکز اور محور سے ہٹ کر، کسی غیر تہذیب کی نقالی کا پیش خیمہ بن جائے، تو نہ صرف اس سے اپنی تہذیب مجروح ہوتی ہے، بل کہ ادب اور زندگی کا رویہ بھی اپنی حقیقی بنیادوں سے ہٹ جاتا ہے اور یوں بے معنویت اور فکری بحران کی عمل داری بڑھ جاتی ہے۔ جب ہمارا معاشرہ: مسلم تہذیب کے ساتھ وابستہ تھا، تو زندگی کی رعنائی اور رنگینی: تازگیِ اظہار کے قرینوں سے عکس انداز ہوتی تھی، مگر معاشرے کی بے راہ روی اور بے سمتی نے نظامِ خیال کی وحدت کو بکھیر کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بہ قول:

"زندگی میں نئے معنی تلاش کرنے کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے، جب کسی کلچر

کی وحدت اور اس کا نظامِ خیال، زندگی میں معنویت پیدا کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے اور تہذیبی رشتے ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر، تیلیوں کی طرح بکھرنے لگتے ہیں۔ اخلاق اور فکر کی مروجہ اقدار میں بدلتے زمانے اور اس کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی قوت باقی نہیں رہتی۔ معاشرے کی خواہشات اور ضروریات، اپنے قدیم تہذیبی اداروں سے متصادم ہونے لگتی ہیں۔ اس وقت ہمارا معاشرہ اسی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اس صورتِ حال نے زندگی کی ہر سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔" [۳۳]

جب کوئی معاشرہ تہذیب اور ثقافت کے بطون میں سفر آشنا رہنے اور اس کی فکری تعبیر کو اُجالنے میں ناکام رہے، تو پھر بے معنویت کی جو فضا جنم لیتی ہے، وہ کسی خوش کن منظر نامے کا اشاریہ نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر جالبی نے اس نوعیت کے مسائل کا ادراک کرتے ہوئے، ادب کی تفہیم اور تعبیر کا کینوس: ثقافت اور تہذیب کے نظامِ فکر تک پھیلا دیا۔ انھوں نے کلچر کی شناخت کے اصول وضوابط بھی مرتب کرنے کی کوشش کی اور اس کے عملی اظہارات کو اُجاگر کرنے کا جتن بھی کیا۔ اس طرح تنقید ان کے لیے ایک تخلیقی سرگرمی بن گئی۔ وہ تنقید کی اہمیت اور معنویت کو ان الفاظ میں اُجاگر کرتے ہیں:

"ادب میرا بنیادی حوالہ ہے اور تنقید میرے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے، جو شاعر کے لیے شاعری؛ ناول نگار کے لیے ناول یا ڈرامہ نویس کے لیے ڈرامہ رکھتا ہے۔ میں تخلیق اور تنقید کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھتا، بل کہ دونوں کے امتزاج کو ضروری سمجھتا ہوں۔" [۳۴]

ڈاکٹر جالبی متوازن، معتدل اور امتزاجی رویوں کے نقاد ہیں۔ ان کے ہاں انتہا پسندانہ رویہ نہیں ملتا، اسی لیے وہ کسی تعصب کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ فکر و فلسفے اور ادب و ثقافت کے امتزاج سے ایک ایسا نظامِ فکر مدون اور مرتب کرتے ہیں، جو زندگی اور ادب کے متنوع رویوں کی ترجمانی میں کامگار ہو سکتا ہے۔ فکر و فرہنگ کا یہ امتزاجی رویہ ان کے تنقیدی سرمائے کا اہم ترنکتہ ہے۔ وہ اسی امتزاجی زاویۂ نظر سے ادب پارے کی متنوع جہات اور حیثیات کا تعین کرتے ہیں، تو ان کا تنقیدی رویہ معنی کی تفہیم اور ترسیل میں ہمہ گیر قدروں کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ وہ تنقید اور تحقیق کی معنوی یک جائی اور فکری اشتراک کے بھی مؤید اور ترجمان ہیں۔ ان کے نزدیک:

"تحقیق کو تنقید سے الگ کرنے میں ہمارے ہاں تنقید میں بے شمار غلطیاں در آئی ہیں اور [ان غلطیوں نے] مطالعۂ ادب کو مشکوک بنا دیا ہے۔ تحقیق: تنقید کی مدد کرتی ہے اور تنقیدی مطالعے کو بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ نئی تنقید اس لیے

تحقیق وتنقید کے امتزاج پر زور دیتی ہے۔ صرف تحقیق ایک علمی کام ہے، جو اس وقت قابلِ ذکر ہوگا، جب اس میں تنقیدی شعور شامل ہو۔" [۳۵]

ڈاکٹر جالبی کے ہاں امتزاجی رویوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ادب میں کلچر، فکر و فلسفے اور تاریخ کے امتزاج کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں کوئی بھی فن پارہ اس وقت تک اپنی معنوی تہ داری کو منکشف نہیں کرتا، جب تک ادبی تنقید: فکر و فرہنگ کی تاریخیت اور فلسفیانہ تفکر کی رنگینی سے مملو نہ ہو جائے، کیوں کہ زمانہ حال کے منظرنامے پر قدیم اور جدید ادب پاروں کا امتزاجی پہلو ہی ان کی معنویت کی گرہ کشائی میں معاون ہو سکتا ہے اور یہ زاویۂ نظر اسی وقت پیدا ہوگا، جب نقاد اپنے فکری اور ذہنی مناسبات میں امتزاجی رویوں کی پاس داری کا فریضہ انجام دے۔

[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے تنقیدی سرمائے اور کلچر شناسی کی اجمالی صورتِ حال کچھ یوں ہے:

تنقید

(۱) تنقید اور تجربہ [۱۹۶۷ء]
(۲) محمد تقی میر [۱۹۸۱ء]
(۳) نئی تنقید [۱۹۸۵ء]
(۴) ادب، کلچر اور مسائل [۱۹۸۶ء]
(۵) قومی زبان: یک جہتی، نفاذ اور مسائل [۱۹۸۹ء]
(۶) قلندر بخش جرأت [۱۹۹۰ء]
(۷) معاصر ادب [۱۹۹۱ء]

کلچر

(۱) پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ [۱۹۶۴ء]
2) Pakistan: The Identity of Culture [1984]
3) The Changing world of Islam [1986]
4) Pakistani culture [1986]

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید نگاری: ان کی فکری جہت کی ترجمان بھی ہے اور ادبی جہت کی آئینہ دار بھی۔ فکری سطح پر ان کا تنقیدی زاویۂ نظر ایک طرف تاریخ اور فلسفے کے ساتھ مربوط ہے، تو دوسری طرف کلچر کے ساتھ۔ ان کا نظامِ فکر و فرہنگ زندگی کے ان مادی، روحانی اور جمالیاتی عناصر سے وجود پذیر ہوتا ہے، جو انسانی زندگی کے اجتماعی اور انفرادی رویوں کی ترتیب اور تہذیب میں معاون ہیں یا ہو سکتے ہیں، کیوں کہ اب تنقید محض ادبی دائروں تک محدود نہیں رہی، بل کہ ادب کی تنگ ناؤں سے نکل کر، فکر کی متنوع جہتوں کے ساتھ ہم کلام ہوگئی اور یوں ایک ایسا زاویہ سامنے آیا، جو ادب اور فکر و فرہنگ کے امتزاج سے تشکیل پا کر، ایک ایسی صورت میں ڈھل گیا، جو مسائل کے تجزیاتی مطالعے میں، تخلیقی رویوں کو جنم دیتا ہے۔ فکر و احساس کی یہ خوبی زندگی کی معنوی فضا کی تلاش اور جستجو میں جس ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کو متشکل کرتی ہے، وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متنوع رنگوں کی ترجمان بن جاتی ہے۔ فکری اور تنقیدی سطح پر یہ رویہ ڈاکٹر جالبی کی تنقید نگاری کا امتیازی وصف ہے۔ فرد اور معاشرے کے مابین امتزاجی رنگ و آہنگ کی تشکیل حسنِ اسلوب کی اس تخلیقی سچائی سے عکس انداز ہوتی ہے، جو تہذیب اور ثقافت کا سرمایۂ افتخار ہے۔ معاشرتی زندگی اپنے تہذیبی اور ثقافتی نظامِ خیال سے کٹ کر، توانا اور مثبت طرزِ فکر سے مربوط نہیں رہتی اور نہ ہی زندگی اپنے فکری اور جمالیاتی مدار میں گردش کناں رہ سکتی ہے، کیوں کہ تنقیدی رویہ: زندگی اور ادب کی متنوع جہتوں کو معنوی حسن بھی عطا کرتا ہے اور فکر و احساس کا قرینہ بھی، جو زندگی کی روح کو ادبی نظامِ خیال کی جمالیاتی اقدار میں دریافت کرتا ہے اور یہ زاویۂ نظر مثبت طرزِ احساس کی تشکیلِ نو سے ہم رنگ بھی رہتا ہے اور ہم آہنگ بھی:

> ''ایک طرف یہ صورت ہے اور دوسری طرف مغرب کے کلچر کی یلغار ہے، جو ہمیں اپنے شکنجے میں جکڑ رہی ہے۔ اس سیلاب میں ہماری اچھی اور بری سب چیزیں اور سب قدریں بہی جا رہی ہیں۔ ہمارا اعلیٰ طبقہ جو انگریزوں کے دورِ غلامی کا وارث ہے، ہمارے کلچر کا نمائندہ نہیں ہے اور چوں کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں ہے، اس لیے وہ ان اقدار کو پروان چڑھنے نہیں دیتا، جس سے قومی کلچر اور قومی تشخص وجود میں آئے۔ اس صورتِ حال میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری تہذیبی روح بھی پرانے سکوں کی طرح، عجائب خانے کی زینت بن جائے گی۔ اس موضوع پر غور کرتے ہوئے، یہ بات بھی ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی قدیم چیز یا قدر زندہ و باقی نہیں رہ سکتی، اگر اس کا رخ جدید کی طرف نہ ہو۔ جب تک وہ روحِ عصر اور تاریخی دھاروں پر نہ بہہ رہی ہو۔ ثقافت یا کلچر حرکت کا نام ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا عمل ہے۔ آگے بڑھنے اور اپنی تخلیقی

قوتوں کو آزاد فضا میں بروئے کار لانے کا نام ہے۔ ایسی فضا اور ایسا ساز گار ماحول پیدا کرنے کا نام ہے، جس میں تخلیقی قوتیں نشو و نما پا سکیں، لیکن ہم اپنے عمل سے، اپنی ثقافت کو عملِ ارتقا اور حرکت سے محروم کر رہے ہیں۔ اس حالت میں ہم آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ قومی تشخص اور قومی ثقافت کو کیسے فروغ دے سکتے ہیں؟ جب تک ہم قومی تشخص اور ثقافت کے لیے فکری بنیادیں فراہم نہیں کریں گے؛ جب تک ہم اپنے مسائل کا شعور حاصل نہیں کریں گے اور توجہ، خلوص اور فراخ دلی سے آزاد فضا میں انھیں پروان نہیں چڑھائیں گے؛ زندگی کو حیرت سے آشنا نہیں کریں گے، یہ مسئلہ ہمیں اس طرح الجھاتا رہے گا اور ہم اس طرح بے جہتی اور ذہنی و مادی انتشار کا شکار رہیں گے۔'' [۳۶]

تنقید، ادب اور کلچر کو کسی قوم کے تہذیبی تشخص اور فکری نظام کے حوالے سے دریافت کرنے میں بھی معاون ہوتی ہے اور اس قوم کے مستقبل کی قدروں کے تعین میں بھی۔...... ماضی کے پس منظر میں، مستقبل کے منظر نامے کے معنوی رشتے کی تلاش ایک ایسے فکری رنگ کی ترجمان بن جاتی ہے، جو فرد اور معاشرے کی زندگی کو حرکت اور عمل سے وابستہ رکھتی ہے اور اسے جمود کا شکار نہیں ہونے دیتی۔

(۳)

ڈاکٹر جالبی کا تنقیدی اسلوب ہمہ گیر بھی ہے اور ہمہ جہت بھی۔ وہ فکر و فلسفے کے امتزاج سے ادبی طرزِ احساس کی تہذیب کرتے ہیں، لیکن تنقید کو فکرِ محض کے دائروں میں مقید کرنے کے بجائے، اسے ادب کی تازگی اور رعنائی کا ترجمان بنا دیتے ہیں۔ ان کا تنقیدی وژن تہ داری کا رنگ رس بھی رکھتا ہے اور پُرکاری کا آہنگ بھی۔ ان کے ہاں کہیں بھی اکہری معنویت اور یک رُخے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ زندگی کے متنوع رنگوں کی ترجمانی وہ فکر، فلسفے اور تاریخ کے امتزاج سے انجام دیتے ہیں۔ ان کے یہ قول:

''فلسفہ و فکر کا ادب اور ادبی تنقید سے وہی تعلق ہے، جو روح کا جسم سے ہوتا ہے، جیسے: جسم بغیر روح کے بے جان ہوتا ہے، اسی طرح ادب و تنقید بغیر فلسفہ و فکر کے بے روح ہوتے ہیں۔ تنقید اور تجربہ [۱۹۶۷ء] میں، میں نے لکھا تھا کہ: 'بیسویں صدی میں جب فلسفہ رفتہ رفتہ سائنس کی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر بے معنی ہوتا جا رہا ہے، میں ادبی تنقید کے ذریعے وہ کام انجام دینا چاہتا ہوں، جو ایک زمانے میں ادب اور فلسفہ الگ الگ انجام دیتے تھے۔ یہ

جملے لکھتے وقت بھی، تنقید و فلسفے کا امتزاج میرے پیشِ نظر تھا اور جب سے یہی
میری کوشش رہی ہے۔ ادب کے تخلیقی دور جب بھی پروان چڑھے ہیں، فلسفہ
ہمیشہ اس کی بنیادوں کے باطن میں عقیدے کا نور بن کر، موجود رہا ہے۔" [۳۷]

ڈاکٹر جالبی کا تنقیدی سرمایہ: امتزاج کی جس متوازن صورت سے رنگ روپ کشید کرتا ہے، وہ خود ان کے نزدیک: "نئی تنقید کا منصب ہے۔" [۳۸] گویا تنقید اور بہ طورِ خاص نئی تنقید یک رخی ہونے کے بہ جائے ہمہ رنگ اور ہمہ جہت ہے، یا اسے ہونا چاہیے۔ انھوں نے اس امتزاجی زاویۂ نظر کی وضاحت بھی کی اور اس کے معنوی ابعاد کو بھی نمایاں کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی سطح ہے، جس پر یہ امتزاج ممکن ہے
؟ اس امتزاج کی تین سطحیں ہوسکتی ہیں۔ ایک سطح: 'فلسفہ و فکر' کی ہے، دوسری سطح:
'ادبی تاریخ' کی ہے اور تیسری سطح: 'کلچر' کی ہے۔" [۳۹]

یہ اقتباس نہ صرف ڈاکٹر جالبی کے امتزاجی نقطۂ نظر کی تعبیر میں معاون ہے، بل کہ ان کے تنقیدی سرمائے کی تفہیم کے لیے بھی ایک ایسا زاویۂ نظر عطا کرتا ہے، جس کی روشنی میں ان کے تنقیدی طرزِ احساس کو سمجھنا آسان تر ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا کہ:

"ڈاکٹر جمیل جالبی 'ادبی تاریخ' میں زیادہ دل چسپی رکھتے ہیں، مگر نقد و نظر
کے میدان میں انھوں نے ادب پارے کو محض ادبی تاریخ کی ایک کروٹ قرار
نہیں دیا، بل کہ اسے ایک منفرد اکائی کے روپ میں دیکھا ہے۔" [۴۰]

یہ 'منفرد اکائی' صرف اسی صورت میں متشکل ہوسکتی ہے، جب نقاد تہذیبی وحدت کی اس قدر و قیمت سے آگاہ ہو، جو انسانی زندگی اور معاشرے کی فکری معنویت کی دلیل بھی ہے اور جمالیاتی اقدار کی آئینہ دار بھی۔...... زندگی کی تمام تر معنویت تہذیب کے باطن میں سفر آشنائی سے ممکن ہوسکتی ہے اور اگر ہماری زندگی اپنی تہذیبی اقدار سے جڑی ہوئی نہ ہو، تو پھر وہ رنگینیٔ احساس اور رعنائیٔ خیال سے محروم ہو جاتی ہے اور یوں فرد کی زندگی اور معاشرے کا اجتماعی رویہ زوال آشنا ہو کر، یک رخے رویوں کا غماز بن جاتا ہے اور زندگی اور ادب بے معنویت سے مملو ہو کر، اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں اور فرد اور قوم اپنے تشخص سے محروم ہو جاتے ہیں۔ قومی اور ملی طرزِ احساس زیاں کاری کے عالم میں گم ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ قومی ادب میں نہ تو زندگی کا تحرک باقی رہتا ہے اور نہ ہی کچھ کر گزرنے اور اپنے آپ کو پا لینے کا جذبہ زندہ رہ سکتا ہے، کیوں کہ تہذیب اور ثقافت کا رنگ رس اگر ہمارے ادب سے منہا ہو جائے، تو پھر ادب نہ تو ہماری زندگی کا آئینہ دار ہوگا اور نہ ہی ہماری قومی شناخت کا باعث!

فرد اور قوم ایک دوسرے کے ساتھ یوں جڑے ہوتے ہیں کہ ان میں دوئی کا شائبہ بھی نہیں ہو

سکتا اور ہونا بھی نہیں چاہیے، کیوں کہ اگر فرد اپنی قوم اور تہذیب سے کٹ کر زندگی کرنے لگے، تو پھر ایسے منفی رویے معاشرتی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں کہ انسانی زندگی اخلاص اور حیات بخش رویوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کا تنقیدی سرمایہ انھی مسائل کے انعکاس اور پھر ان کے منظرنامے سے کلچر کی شناخت اور تفہیم سے عبارت ہے۔ بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''قومی مسائل سے ان کی گہری دل چسپی جس نوعیت کی ہے، وہ ایک دردمند آدمی ہی کی ہو سکتی ہے۔ پاکستان کی تعمیر کے لیے ان کے خیالات و افکار کو میں نے ہمیشہ بصیرت افروز پایا۔ وہ ایک سچے پاکستانی ہیں اور سچے ادیب بھی۔ سچا ادیب وہ ہوتا ہے، جو بکھرے ہوئے لوگوں کو مجتمع کرے؛ محبت کا پیغام دے؛ نفرتوں کے کاروبار سے دور رہے اور دور رکھے اور ادب کو وصل کا، نہ کہ فصل کا ذریعہ بنائے۔''[۴۱]

(۴)

جمیل جالبی کی تنقید نگاری: حق اور حقیقت کی تلاش سے عبارت ہے۔ انھوں نے جن مسائل پر تفکر کیا، ان کا بہ راہِ راست تعلق تہذیب کے ان سرچشموں سے وابستہ ہے، جو ایک طرف مذہب کے اس تصورِ حقیقت سے جڑے ہوئے ہیں، جن کی بنیاد وحی پر ہے، تو دوسری طرف وہ ادب اور ثقافت کو روایت کے اس تسلسل میں دریافت کرتے ہیں، جو فکرِ انسانی کے جمالیاتی رویوں کو اس کے فکری اور معنوی تناظر میں اُجالنے سے متعلق ہیں، کیوں کہ اس طرح روایت اپنے تہذیبی زاویہ ہائے نظر سے ہوتی ہوئی مذہبی تجربے سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ جالبی صاحب روحِ عصر کے تشخص اور اس کی انفرادیت کے بے حد قائل ہیں۔ ان کے نزدیک عصری طرزِ احساس کی شناخت کے بغیر ادب کی صحیح تعبیر ممکن نہیں ہوتی، ہو سکتی بھی نہیں، کیوں کہ حال کے منظرنامے کی تفہیم ماضی کی ان تہذیبی اقدار سے وابستگی پر منحصر ہوتی ہے، جو مستقبل کے فکری پیش منظر کا ادراک کرتی ہیں۔ یہ وہ تنقیدی اوصاف ہیں، جو تہذیبی اور ثقافتی مظاہر کی خوشبو سے معطر رہتے ہیں۔ وہ مذہبی تفکر سے روشنی کشید کرتے ہیں اور یہ روشنی تہذیبی رویوں میں سفر کرتی ہوئی مشکوٰۃِ نبوت کی جلوہ ریزیوں سے مستنیر ہو جاتی ہے۔

جالبی صاحب کا تنقیدی وژن: اسی طرزِ احساس کی رنگینی اور رعنائی سے مملو ہے۔ ان کی فکر: عصری مسائل کی تعبیر اور تفہیم کو وجدانی طرزِ اظہار کی بوقلمونی سے ہم آہنگ کر کے ایک ایسی صورت میں عکس انداز کرتی ہے کہ فکر و خیال کے دریچے تہذیبی اور روایتی نظامِ فکر کے آنگن میں آن کھلتے ہیں۔ ان کی تنقید......وجدان کی مکاشفاتی اپیل سے بیگانہ نہیں رہتی، بل کہ یہ وجدانی رویوں سے رنگا رنگی کی کشید کو

ادب کے کینوس میں مرتب اور متشکل کرنے سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تنقیدی سرمایہ: معنوی اور جمالیاتی تہ داری سے ہم رنگ اور ہم آہنگ رہتا ہے۔ وہ فکر و خیال کی اکہری معنوی تعبیر پر یقین نہیں رکھتے، بل کہ اسے فکری تہ داری سے مملو کر کے گنجینۂ معنی کا طلسم کدہ بنا دیتے ہیں۔ بہ قول پروفیسر رشید احمد صدیقی:

> ''ان کی تحریر میں نہ صرف عصری، تہذیبی اور ادبی رجحانات کی معتبر عکاسی، بل کہ ان کی فکر انگیز تعبیر و توضیح بھی ملتی ہے۔ باوجود اس کے کہ بعض امور میں، اپنے آپ کو ان کی رائے سے متفق نہیں پاتا، [لیکن] ان کی غیر معمولی تنقیدی اور توضیحی صلاحیت کا معترف ہوں۔ اپنے فکر و نظر، ادبی ذوق اور سلیس و شگفتہ اندازِ بیان کی بنا پر جدید اردو تنقید نگاروں میں جالبی صاحب ایک ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔'' [۴۲]

ڈاکٹر جالبی کی تنقید: ادب اور کلچر کے فکری رویوں کی آئینہ دار ہے۔ ان کے ہاں تنقید کے پس منظر میں کلچر کا منظر نامہ اپنے تمام تر فکری اور جمالیاتی احساس کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ ان کا یہ تنقیدی احساس فکر و فلسفے کے امتزاج سے پھوٹتا ہے۔ وہ کلچر اور تہذیب کے مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں کلچر اور اس کے رجحانات کا فکری مطالعہ ان کی تنقید کو وہ رچاؤ عطا کرتا ہے کہ جس سے تنقید کا منظر نامہ رنگا رنگی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ وہ کسی مخصوص دبستانِ تنقید یا فلسفے کے مخصوص اسکول سے وابستہ نہیں، بل کہ صداقت کی تلاش، ان کا وہ بنیادی فلسفہ ہے کہ جو ان کی تنقید کو فکری اور جمالیاتی بنیادیں عطا کرتا ہے۔

انسانی زندگی..... تہذیب اور ثقافت کے فکری اور جمالیاتی آہنگ سے جڑی ہوتی ہے۔ زندگی کی کلّی معنویت کا احساس تہذیبی معنویت کے جمالیاتی رنگوں سے پھوٹتا اور برگ و بار لاتا ہے، کیوں کہ زندگی اور تہذیب میں ایک ایسی فکری اور اساسی روح کار فرما ہوتی ہے، جس کا ادراک ہر دو کی تفہیم کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی اپنے تاریخی تناظر میں تہذیبی اکائی کا محض اشاریہ نہیں ہوتی، بل کہ یہ اس صداقتِ احساس سے وجود پذیر ہوتی ہے، جو اس کی حیاتِ دوام کا سبب بنے۔ زندگی اور تہذیب میں فکری ہم آہنگی: ادب اور ثقافت کی تشکیل اور ترتیب میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ زندگی کی سماجی اور معاشرتی اقدار: تہذیب کی علامتی معنویت کو جب ادب کے ثقافتی مظاہر میں عکس انداز کرتی ہیں، تو اس کی فکری بنیادیں زندگی کی جمالیات سے مملو ہو جاتی ہیں اور یوں زندگی کی فکری اور معنوی تعبیر کا وہ قرینہ ہاتھ آتا ہے، جو تہذیب کے باطن سے پھوٹتا ہے اور ادب کے دائرے میں زندگی کی ترجمانی کا آئینہ دار بن جاتا ہے اور یہی انفرادیت ان کے تنقیدی وژن کی شناخت بھی ہے اور ان کی فکری معنویت کی نقیب بھی۔ وہ ادب کا مطالعہ: تہذیب اور ثقافت کے اس فکری پس منظر میں مرتب کرتے ہیں، جو ان کے طرزِ

احساس کو رعنائی خیال کی متنوع جہات کا آئینہ دار بنا دیتا ہے۔ کلچر اور اس کے مسائل: ان کے تنقیدی سرمائے کا بنیادی اور اساسی موضوع ہیں اور یہی موضوعات ان کے فکری اور تنقیدی نظام کو گیرائی بھی عطا کرتے ہیں اور گہرائی بھی......اور لطف کی بات یہ کہ ثقافت اور ادب کی یہی امتزاجی معنویت ہی ان کے فکر و فرہنگ کی پہچان ہے۔ ادب اور کلچر کی معنوی اور جمالیاتی بنیادوں کو نہ ان سے قبل کسی نے موضوع بنایا اور نہ ہی بعد میں۔ یہ مسائل اور ان کا فکری اظہار یہ انھی سے مخصوص ہے۔ یہ ان کی شناخت بھی ہے اور ان کی فکری توانائی بھی۔ ان کے نظامِ فکر میں زندگی کے سارے رنگ رس اسی طرزِ فکر اور اس کی ترجمانی سے مزیّن ہیں۔ وہ زندگی کی جمالیات کو ادب اور ثقافت کی اس معنوی جمالیات سے مرتب کرتے ہیں، جو اسلامی تہذیب کے تصورِ حقیقت اور اس کی تعبیر کے عکاس ہیں، کیوں کہ:

> ''پاکستان کا وجود صرف و محض کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا، بل کہ دو طرز ہائے احساس کی جنگ تھی، جس میں ہندو طرزِ احساس اور مسلم تہذیبی طرزِ احساس الگ الگ سوچ بن کر اپنا الگ نظامِ شمسی قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کی باہمی نفرت کی طویل داستان بھی دراصل جدا تہذیبی طرزِ احساس کی داستان ہے۔'' (۴۳)

تنقید اگر محض ادب کے گلستان تک محدود ہو، تو اس میں مذہب، تہذیب اور کلچر کے خوش رنگ اور دل کش پھول نہیں کھلتے: اس میں حیاتِ دوام کی خوش بو مشک بار نہیں ہوتی، لیکن ادب......اگر ادب کی سطح سے اُٹھ کر مذہب، تہذیب اور کلچر کے مسائل کی رنگ آمیزی سے اپنی صورت کے تعین اور قدر و قیمت کی تشکیل میں سرگرمِ کار ہو، تو پھر اس کا دائرۂ اثر بڑھ کر انسانی زندگی کے تمام تر رویوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ وہ انسان کے داخلی اور خارجی مظاہر کی تعبیر کو ایسے خطوط پر مرتب کرتا ہے، جہاں اس کے فکری تناظر میں زندگی کے رنگ رس آشکار ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید میں یہ فکری رویہ اپنی جمالیاتی اساس اور مثبت طرزِ فکر کے ساتھ موجود ہے، اسی لیے ان کا تنقیدی سرمایہ اپنی منفرد اور ممتاز حیثیت کا آئینہ دار بھی ہے اور تہذیبی سطح پر ہمارے مستقبل کی معنی آفرینی کا ترجمان بھی! اور یہ آئینہ داری اس نظامِ فکر کو مرتب کرتی ہے، جو تہذیب کی فکری اور جمالیاتی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ تہذیبی بنیادیں: ادب اور کلچر کو حسنِ خیال کی وہ رعنائی عطا کرتی ہیں، جو ایک طرف اس کی حیاتِ تازہ کی دلیل بھی ہوتی ہیں اور دوسری طرف اس کی حیاتِ دوام کی نوید بھی۔

جالبی صاحب کے ہاں ادب کے تناظر میں تہذیب اور ثقافت کی یہ ترجمانی اپنے فکری اور معنوی خدوخال کے ساتھ اس صداقتِ احساس کو متشکل کرتی ہے، جو تہذیبی اکائی کے جمالیاتی رنگوں کی آئینہ دار ہے۔ ان کے نظامِ فکر میں صرف ادب ہی زندگی کی معنویت کا استعارہ نہیں، بل کہ ادب، ثقافت اور تہذیب اپنی کلیت کے ساتھ ایک اکائی میں سمٹ کر، اس تصورِ حقیقت کی تعبیر اور تفہیم میں معاون ہے، جو

اپنے داخلی حوالے سے اسلام کے ادبی اصولوں سے مزین ہے۔

جالبی صاحب کی تنقید ایسے سوالات اٹھاتی ہے، جو تہذیبی تناظر میں ادب اور ثقافت کے باہمی تال میل سے ایک ایسے فکری رویے کی تشکیل کرتے ہیں، جو ایک طرف معاشی، معاشرتی، سماجی اور ادبی مسائل کے آئینہ دار ہیں، تو دوسری طرف روحانی اور جمالیاتی عناصر کے امتزاج سے وجود پذیر ہونے والے اس فکری نظام کی معنویت کے عکاس ہیں، جو زندگی کے باطنی اور خارجی رویوں کی یک جائی سے مربوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید زندگی کے جامد اور بے معنی رویوں سے عبارت نہیں ہوتی، بل کہ یہ زندگی کی اس متحرک جمالیات سے سے کسبِ نور کرتی ہے، جو انسان کے وجود کے اثباتِ دوام کی دلیل بھی ہیں اور نوید بھی! وہ معاشرے کے روح پرور معاملات کی تعبیر عصری مسائل کے تناظر میں انجام دیتے ہیں اور یوں معاشرے کا منظرنامہ اپنے مجموعی فکری تناظر میں سامنے آتا ہے۔ وہ تہذیب کے روحانی اور مادی رویوں کی یک جائی سے ایک ایسے فکری نظام کو مرتب کرتے ہیں، جو فرد کی زندگی کی اکائی کا آئینہ دار بھی ہے اور معاشرے کی اجتماعیت کا علم بردار بھی۔ احمد ہمدانی کے بہ قول:

> ”وہ صرف ادب ہی کو کلچر اور ادبی روایت کے آئینے میں دیکھنے کے قائل نہیں ہیں، بل کہ تمام دوسرے معاشرتی مسائل کے سلسلے میں بھی وہ اپنے کلچر کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے، ان مسائل پر گفتگو کرتے ہیں۔ گویا قومی کلچر ان کی فکر کا بنیادی موضوع ہے۔ وہ زندگی کو نکھارنے، سنوارنے، آگے بڑھانے اور اس کو تبدیل کرنے کے ضرور قائل ہیں، لیکن یہ سب کچھ وہ اپنے مخصوص کلچر کے تقاضوں کی مطابقت میں انجام دینے پر زور دیتے ہیں۔ اپنے کلچر سے گہری وابستگی بلاشبہ ان کی شناخت ہے“۔[۴۴]

(۵)

ڈاکٹر جالبی نے اپنے تنقیدی وژن کو اظہار کا وہ قرینہ عطا کیا، جو مذہب، تہذیب اور کلچر کے معنوی نظام سے ہم آہنگ ہو کر ادب اور اس کے عصری مسائل کو ایک ایسے فکری سرچشمے سے وابستہ کرتا ہے، جو اپنے معنوی آہنگ اور جمالیاتی رنگ میں منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی!......اور یہ بصیرت: تہذیب کے معنوی خدوخال کو اسلام کے تصورِ حقیقت کے پس منظر میں رکھ کر دیکھے بنا پیدا نہیں ہو سکتی۔ لمحۂ موجود میں، جب تک ماضی اور مستقبل کے فکری دریچے ایک مقامِ اتصال پر نہ کھلتے ہوں، یہ بصیرت اور آگہی ہاتھ نہیں آتی، کیوں کہ فردا اور ماضی کو لمحۂ موجود کے پیش نامے پر، دیکھنے والی آنکھ ہی اس آگہی کے درد سے آگاہ ہو سکتی ہے۔ بہ صورتِ دیگر حال میں رہ کر، صرف ماضی میں جھانکنا، یا صرف حال کے منظرنامے پر

عصری حسیت کی ترجمانی کرنا، یا پھر صرف روشن مستقبل کے خواب دیکھنا...... ممکن ہے خوش گمانی کے موسم کا اشاریہ ہو، تو ہو، مگر انسانی زندگی کی ماورائے زمان اس جمالیات کا نقیب نہیں ہو سکتا، جو زندگی کی کلیت کو ماضی، حال اور مستقبل کے منظر نامے پر ایک ساتھ دیکھنے اور اس کی تعبیر کو اس کے مجموعی تناظر میں مرتب کرنے سے عبارت ہوتی ہے۔ سلیم احمد کے بہ قول:

> ''جمیل جالبی نئے لوگوں میں ان گنتی کے چند لکھنے والوں میں سے ایک ہیں، جن کی تحریر میرے لیے معنی رکھتی ہے۔ میرے اپنے خیالات کے کئی گوشے مجھ پر واضح نہ ہوتے، اگر جمیل کی تحریریں میرے سامنے نہ ہوتیں۔'' [۴۵]

ڈاکٹر جالبی معاشرے اور فرد کے باہمی رشتے اور تعلق کو تہذیبی جمالیات کی روشنی میں اخذ کرتے ہیں اور پھر ان رویوں کا ادب میں اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ انسانی زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تہذیب شناسی اور کلچر شناسی کی اکہری معنویت کے تعین کے بہ جائے اس کی فکری تہ داری کی معنویت کو اُجاگر کرنے کا جتن کیا۔ وہ نہ محض داخلی اور باطنی رویوں کے آدمی ہیں کہ تہذیب اور ثقافت کے باطنی [اور روحانی] خدوخال کو ادب کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس کی اکہری معنویت کو مرتب کر دیں اور نہ ہی وہ محض خارجی [اور ظاہری] رویوں کے پاس دار ہیں کہ تہذیب و ثقافت کا فکری منظر نامہ اس کے خارجی عوامل سے متشکل کریں۔ وہ تہذیب کے داخلی اور خارجی عناصر اور مظاہر کے فکری اتصال سے ایک ایسی اکائی کا کھوج لگاتے ہیں کہ جو اس کے نظامِ فکر کے داخلی اور خارجی زاویہ ہائے نظر کو محیط ہوتے ہیں اور تہذیب و ثقافت کی یہ تعبیر اور ترجمانی فکری اور عصری مسائل کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھے بنا ہاتھ نہیں آتی۔ جالبی صاحب نے جہاں مادی مسائل کی تفہیم کو اس کے کلچر کے تناظر میں دیکھنے اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی سعی کی، وہیں پر انھوں نے کلچر کے باطنی رویوں کے اظہاریے میں بھی کوتاہی نہیں کی، بل کہ وہ ان دونوں کی یک جائی سے مرتب ہونے والی تہذیبی اکائی سے معنوی اور فکری جمالیات کی تفہیم میں سرگرمِ کار رہے۔

(۶)

جمیل جالبی نے قدیم ادب پر بھی لکھا اور جدید ادب پر بھی۔ وہ مشرق کی تہذیب، ادب اور کلچر کے نبض شناس بھی ہیں اور مغربی فکریات کا نظام بھی ان کی نگہ ناز سے پوشیدہ نہیں۔ ہر صنفِ ادب ان کے سامنے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ کسی بھی عہد کا کوئی بھی شاعر اور ادیب ان کے لیے اجنبی نہیں۔ وہ تاریخی اور زمانی اعتبار سے ادب اور کلچر کو ان کے وسیع تر کینوس میں دیکھتے ہیں، لہٰذا ان کے لیے ادب محض تعریف و توصیف، نعرے بازی یا عام سستے رویوں کی عارضی اور وقتی تعبیر سے عبارت

نہیں ہوتا، بل کہ ادب ان کے لیے انسان شناسی کا ایک ایسا ذریعہ ہے کہ جس کی وساطت سے تہذیب ،کلچر، نظام ہائے فنونِ لطیفہ کی تفہیم کا منظر نامہ مرتب اور متشکل ہو سکتا ہے۔ وہ کسی فرد [شاعر یا ادیب] پر لکھتے ہوئے، اس کے تخلیقی آہنگ کا کوئی ایسا دریچہ وا کرتے ہیں کہ پیشِ نظر شخصیت بالکل ایک نئے اسلوب اور آہنگ میں ڈھل جاتی ہے۔......اسی طرح اجتماعی مسائل کی گرہ کشائی میں بھی وہ ایسا منظر نامہ تشکیل دیتے ہیں کہ فکر وفن کے چراغ جل اٹھتے ہیں۔ جس طرح وہ تہذیب وثقافت کے داخلی اور خارجی رویوں کی یک جائی اور اکائی سے ان کی معنویت کو متعین کرتے ہیں، بالکل اسی طرح وہ انسانی زندگی کے معاشرتی نظام کا مطالعہ فرد کی فردیت اور اس کی اجتماعیت کے تناظر میں مرتب کرتے ہیں۔ فرد اپنی ذات میں انفرادیت کا نمایندہ بھی ہے اور معاشرتی نظام میں اجتماعیت [کل] کا جزو بھی۔ فرد کی یہ حیثیت 'کل' اور 'جزو' کی معنویت سے عبارت ہے۔ وہ اپنی ذات کی اکائی اور معاشرے کے اجتماعی نظام میں کس قدر و قیمت کا حامل ہے، یہی وہ بنیادی موضوع ہے، جو انسانی زندگی کے مطالعے میں، اس کے داخلی اور خارجی رنگوں کا عکاس بن جاتا ہے۔ جالبی صاحب کے ہاں انسانی زندگی کی تعبیر اور اس کی تفہیم کا یہی زاویۂ نظر 'جزو' اور 'کل' کا منظر نامہ مرتب کرتا ہے اور پھر اسی منظر نامے سے وہ ادب اور کلچر کے فکری اور معنوی 'Shades' متعین کرتے ہیں۔ اردو تنقید کی روایت میں یہ طرزِ ادا ڈاکٹر جالبی سے مخصوص ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے بہ قول:

> ''وہ حالی سے لے کر آج تک کے تمام اردو تنقید نگاروں میں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ یہ رائے بڑی چونکا دینے والی معلوم ہوتی ہے، مگر میں بیس برس سے اس کی تصدیق کر رہا ہوں اور اب مجھے اس پر پورا یقین ہے۔'' [۴۶]

(۷)

ڈاکٹر جالبی نے پاکستانی کلچر کی تلاش اور جستجو میں داخل اور خارج کے انفرادی اور اجتماعی رویوں کو جس طرح روحانی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی، اس نے ان کے ہاں مشاہداتی اور مکاشفاتی رویوں کی تفہیم کو بالکل ایک نئے اور منفرد رنگ و آہنگ سے مرتب کیا۔ انھوں نے کلچر کی معنویت کی تشکیل میں مادی اور روحانی ہر دو نظام ہائے فکر سے استفادہ کیا۔ وہ کلچر کو صرف نہ مادی رویوں پر استوار کرتے ہیں اور نہ ہی محض روحانی رویوں پر، بل کہ ان کے ہاں دونوں کی معنوی یک جائی سے ایک ایسا جمالیاتی قرینہ مرتب ہوتا ہے، جو کلچر کے معنوی نظام کی تشکیل میں ممد ومعاون ہے۔ وہ کلچر کی جمالیات کو معاشرتی زندگی کے اس تصورِ تہذیب اور تصورِ حقیقت سے اُجاگر کرتے ہیں، جہاں مذہب کا فکری دھارا مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔

جالبی صاحب نے تہذیبی وحدت کی تعیین اور اس کی شناخت کے رویوں کی تعبیر و تفہیم میں اسلامی فکر و فلسفے کی روایت سے بھی اخذ و استفادہ کیا اور نئے علوم و فنون سے بھی۔ ان کا ادبی شعور اور تنقیدی وژن: تہذیب کے گہرے اور وسیع تر مطالعاتی کینوس سے پھوٹتا ہے۔ وہ ادبی اور معاشرتی اقدار کی تشکیل میں تہذیبی اور ثقافتی مظاہر کی ہمہ رنگی اور ہمہ گیری کے تناظر میں، ایک ایسے رنگِ سخن کی نمود کرتے ہیں، جو ان کے مثبت طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ ان کے ہاں قدیم اور جدید ادب کو مختلف اور الگ الگ خانوں میں رکھ کر دیکھنے کا رویہ نہیں ملتا، بل کہ وہ قدیم و جدید ادب کا مطالعہ ان تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی روشنی میں مرتب کرتے ہیں، جو کسی بھی زبان، ادب اور قوم کی امنگوں کا ترجمان ہوتا ہے، یا اسے ہونا چاہیے اور ادب کا یہی مطالعاتی آہنگ ان کے تنقیدی طرزِ احساس سے خوش بو کشید کرتا ہے۔

پاکستانی کلچر کی شناخت اور جمالیاتی تفہیم کے ضمن میں جالبی صاحب کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ انھوں نے تہذیب اور ثقافت کی معنویت کو اس کے مجموعی فکری تناظر میں متعین اور مرتب کرنے کی سعی کی۔ جمیل جالبی نے تہذیب کے داخلی اور خارجی عناصر کے جمالیاتی رویوں کو ان کے مخصوص فکری اور معنوی منظر نامے میں عکس انداز کیا۔ وہ ہند اسلامی تہذیب کے مادی اور روحانی عناصر کے امتزاج اور آمیزش سے اس نظامِ فکر کے تعین میں کوشاں رہے۔

(۸)

جمیل جالبی نے پاکستانی تنقید کی روایت میں سب سے پہلے ثقافت اور کلچر کی تعبیر کو اُجاگر کرنے کے لیے کچھ ایسے سوالات اٹھائے، جن سے ہماری تنقید اور ہمارا فکری طرزِ احساس آشنا نہ تھے۔ ان کے بہ قول:

> ”ہم پاکستان کے سب باشندے اس ہند مسلم ثقافت کے وارث اور جانشین ہیں، جو اس برِ صغیر میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دورِ حکومت میں یہاں کی فضا، مزاج، آب و ہوا اور میل جول کے زیرِ اثر پروان چڑھی ہے، جس میں عربوں کا مذہبی جوش اور آورش بھی شامل ہے اور افغانوں، ایرانیوں، ترکمانوں اور مغلوں کا مزاج اور روح بھی، نہ صرف یہ، بل کہ جس کی روح نے برِ صغیر پاک و ہند کی روح کو اپنے مزاج میں سمو کر تہذیب کا ایک ایسا نمونہ پیدا کیا تھا، جو کم و بیش آج برِ صغیر کی زندہ تہذیب کی بنیاد ہے، جس میں وہ عناصر بھی شامل ہیں، جنھیں ہم الگ الگ رکھ کر دیکھ رہے ہیں اور وہ عناصر بھی، جو اس میل جول اور ربط ضبط کا منطقی نتیجہ تھے۔ ہم جو کچھ ہیں، اسی تہذیب کا نتیجہ ہیں، جس کا

صحت مند عمل ایک ہزار سال تک جاری رہا اور جسے ہم اپنی تخلیقی قوتوں سے سیراب کرتے رہے۔" [۴۷]

جالبی صاحب کی تنقید نہ تو نعرے بازی سے متشکل ہوتی ہے اور نہ ہی متعصبانہ نظریہ سازی سے، کیوں کہ انھوں نے تنقید کو ایک ایسی تخلیقی جہت عطا کی، جو وجدانی اور مکاشفاتی طرزِ فکر کی عکاس ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے مشرق اور مغرب کے نظام ہائے تنقید سے اخذ و استفادہ کیا، لیکن ان کے وجدان کی تازگی اور رعنائی ان کے تنقیدی شعور کی انفرادیت کی امین رہی...... وہ کسی ایک دبستانِ تنقید سے وابستہ نہیں رہے، بل کہ انھوں نے تنقیدی ادب کو ایک نیا اور تازہ ولولۂ شوق عطا کیا، جو انھیں معاصر نقادوں سے منفرد اور ممتاز بنا دیتا ہے۔ انھیں پڑھتے ہوئے انگریزی نقادوں میں ایلیٹ اور مشرقی نقادوں میں محمد حسن عسکری یاد تو آتے ہیں، مگر ان کے ذہنِ رسا کی تازگی انھیں کچھ ایسے منظر ناموں کی تعبیر عطا کرتی ہے، جو دُنیائے ادب میں انھی سے مخصوص ہیں۔

جمیل جالبی کی تنقید نہ تو تنقیص کے دائروں میں سفر آشنا رہتی ہے اور نہ ہی تحسینِ محض کی مہمل اور بے معنی تعبیر، ان کے زاویہ ہائے فکر کو متاثر کرتی ہے، کیوں کہ کوئی بھی نقاد جب فرد اور معاشرے کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ ہو جائے، تو اس کا تنقیدی شعور ایک ایسے تاریخی آہنگ سے وجود پذیر ہوتا ہے، جو سچائی اور صداقت کے منظر نامے کا اظہاریہ ہو۔ جالبی صاحب کی تنقید: معاشرتی اور سماجی اقدار کی کو ملتا کے احساس سے معطر ہے۔ ان کا فکری وژن: تہذیب و ثقافت کے فن کدے سے گنجینۂ معنی کی جمالیاتی معنویت کی ایسی تعبیر مرتب کرتا ہے، جو رعنائی خیال کے نئے سویروں کی نوید بن جاتی ہے۔ تنقید کے ان منظر ناموں کی تشکیل، معاصر تنقیدی منظر نامے میں، کہیں اور نظر نہیں آتی۔ لے دے کر محمد حسن عسکری کا دبستانِ تنقید ہی یاد رہتا ہے اور بس۔ خود ڈاکٹر جالبی بھی اسی دبستانِ علم و آگہی کے فردِ فرید ہیں۔ انھوں نے اپنے تنقیدی سفر کا آغاز عسکری صاحب کے فکری اور تہذیبی تناظر سے روشنی اور خوشبو کشید کرتے ہوئے انجام دیا، لیکن وہ ان کی تقلید کے حصار سے ہمیشہ باہر رہے۔ انفرادیت ایک ایسی خوبی ہے، جو ہر دور میں ان کے تنقیدی شعور اور فکری احساس کی ترجمان رہی۔

محمد حسن عسکری سے متاثر ہو کر تنقید لکھنے والوں میں: جمیل جالبی، سلیم احمد، شمیم احمد، مظفر علی سید، جمال پانی پتی اور سراج منیر کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔...... ان کے ہاں شاید روایت کے تصور میں وہ مذہبی ہم آہنگی بھی دکھائی دے، جو اسلام کے تصورِ حقیقت سے مستعار ہے، لیکن ان سب میں فکری طرزِ احساس اور نقطۂ نظر کی تعبیر بالکل مختلف اور منفرد رنگا رنگی سے مرتب ہوتی ہے۔ ان سب کے ہاں تہذیبی جمالیات کی روایتی معنویت کی ہم آہنگی کے سوا، شاید ہی کوئی دوسری خوبی مشترک ہو۔

(۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہمارے فکری اور تہذیبی طرزِ احساس کو ادب کی تنقید کا ایسا زاویہ نظر فراہم کیا، جو ہماری تنقیدی روایت کا بالکل منفرد اور جداگانہ تجربہ ہے۔ وہ روایت کے پاس دار ہیں، کیوں کہ روایت سے انحراف: تہذیب اور کلچر سے انحراف کے مترادف ہے۔ وہ روایت کے تصور کو اس کے فکری، تہذیبی اور جمالیاتی آہنگ میں رکھ کر دیکھتے ہیں، تو ادب کی ایک بالکل نئی تفہیم سامنے آتی ہے، جو ادب اور روایت کے وسیع تر معنوی نظام کی دین ہے۔ اگر ادب: زندگی اور اس کے رویوں کا عکاس ہے، تو زندگی بھی کسی تہذیب اور کلچر سے متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا زندگی، ادب اور کلچر باہم جڑے ہوئے ہیں۔ ان کو کلیت میں دیکھنا اور ان کی تعبیر وتفسیر کرنا یقیناً ایک کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ادب کو تہذیب، روایت اور تاریخ کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھتے ہیں، تو ان کے ہاں ادب کا بالکل ایک نیا طرزِ احساس جنم لیتا ہے، جو ان کی انفرادیت کی دلیل تو ہے ہی، ادب کے تنقیدی سرمائے میں ایک نئے آہنگ کا مژدہ بھی ہے۔

جمیل جالبی کے تنقیدی وجدان کی تعبیر ہونا ابھی باقی ہے۔ انھیں پاکستان میں تنقید کی روایت میں وہ مقام نہیں دیا گیا، جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان کے تحقیقی آہنگ نے ان کے تنقیدی طرزِ احساس کو دبا دیا، حالاں کہ تاریخِ ادبِ اردو ان کے تحقیقی اور تنقیدی شعور کے امتزاج کا ایک ایسا منظر نامہ ہے کہ جہاں ہم ان کے اس شعور اور احساس کے پس منظر میں موجود اس تہذیبی رچاؤ اور ادبی منظر کا نظارہ کر سکتے ہیں، جو ہند اسلامی تہذیب سے متعلق ہے۔ ان کی تحقیق: ان کے تنقیدی رویوں سے آشکار ہوتی ہیں اور تنقید: ان کے تحقیقی سرمائے کی اوٹ سے لودے اٹھتی ہے۔ ان کی ہر تحقیقی اور تنقیدی کتاب ان کے اس امتزاجی رنگ کی آئینہ دار ہے، جس میں تحقیق اور تنقید کے رنگا رنگ پھول ایک سرسبد میں سج کر، رنگوں کی ایک ایسی بہار کا سراپا اوڑھ لیتے ہیں کہ جہاں: 'ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است' کے مصداق انھیں علاحدہ علاحدہ شناخت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اکائی کی صورت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ تہذیب کی جزوی اور متنوع صورتوں سے اس کی کلی اور جاوداں صورت کے تعین میں سرگرمِ کار رہتے ہیں اور ادب اور اس کی مختلف اصناف کا مطالعہ کرتے ہوئے، وہ اسی قاعدے کلیے کے مطابق اس کی کلی صورت کو آشکار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

(۱۰)

تخلیق ہو کہ تنقید؛ تحقیق ہو کہ ترجمہ...... اگر یہ محض میکانکی اور تکنیکی عمل سے عبارت نہ ہوں، تو روح کے سفر اور اس کی تلاش سے پھوٹتے ہیں۔ یہ گمان اور یقین کے موسم میں برگ و بار لاتے ہیں۔ نفی سے

اثبات تک ان کا پھیلاؤ: ایک وجدانی اور مکاشفاتی اشاریہ مرتب کرتا ہے۔ یہ تہذیب اور مذہب کے تصورِ حقیقت اور روایت سے رنگ اور آہنگ سمیٹتے اور پھر انھیں جمالیاتی رنگ رس سے مملو کرتے ہیں۔ تاریخ، تہذیب، ادب اور کلچر کا مکالماتی اُسلوب روح کے سفر کا ترجمان بن جاتا ہے اور یہ ترجمانی عرفانِ ذات کے موسموں کی بشارت بن کر سامنے آتی ہے۔ ادب، ثقافت اور تاریخ کا منظرنامہ اپنی ترتیب وتہذیب میں حسنِ ذات کے توازن اور ہم آہنگی سے رنگ اور خوشبو کشید کرتا ہے، تو اس کی معنوی اور جمالیاتی اپیل نئے سویروں کی نوید بن جاتی ہے۔ بطونِ ذات کے موسم: روح کے سفر کو ایک نئی دنیا کے پیش منظر سے نہ صرف ہم آہنگ رکھتے ہیں، بل کہ اسے ایک نئے جہانِ معنی کی شناخت کا قرینہ بھی عطا کرتے ہیں۔ روح اپنے تہذیبی اظہار میں ایک ایسے معنوی اور فکری تسلسل سے عبارت ہوتی ہے، جو اس کے ارتقا کو ہمہ رنگی اور ہمہ گیری کا اظہاریہ بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تنقید نگاری کے عمل میں، اپنی روح کے سفر اور اس کی شناخت کا جو منظرنامہ مرتب کیا، وہ اپنی فکری بصیرت اور رعنائی احساس کے اعتبار سے ہمہ جہت بھی اور ہمہ گیر بھی۔ اس کی شناخت اور عرفان: ثقافتی آثار کے بطون میں سفر آشنائی کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ تہذیب اور ثقافت کی ترجمانی: ادب اور زبان کی وساطت اور تناظر میں، نئے معنوی نظام کی تلاش سے عبارت ہوتی ہے۔ جب لکھنے والا تہذیب اور کلچر کی تفہیم اور تعبیر کی جمالیاتی معنویت اور اس کے اسلوب کے کلی نظامِ خیال سے آگاہ ہو، تو نئے معنوی نظام کی ضرورت اور اس کی افادیت نہ صرف منکشف ہوتی ہے، بل کہ بڑھ جاتی ہے۔ بہ قول شان الحق حقی:

> ''تہذیب ایک زندہ روایت کا نام ہے اور زندگی کی شرط ہے افزائش ونمو۔ کسی تہذیبی نظام کی زندگی کا پتا اس کے آثار سے زیادہ اس کی رفتار سے ملتا ہے۔ ماضی کے آثار ونقوش اس کے وجود کا صرف ایک رخ ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرا رخ جدید افکار ومیلانات سے معلوم ہوتا ہے۔ تہذیب اپنے کارناموں سے پہچانی جاتی ہے۔ رسوم و روایات بھی قوم کی کثیر الابعاد شخصیت کا ایک پہلو ہیں، مگر زندہ تہذیب ترقی کی جہت اپنے لیے کھلی رکھتی ہے، روایات کو مقصود بالذات نہیں بناتی، جو تہذیبیں روایات میں محصور ہوتی گئیں، زمانہ انھیں پیچھے چھوڑتا گیا، جیسے کہ بعض ابتدائی قبائل کی تہذیبیں، جو عمرانی تاریخ کی یادگاریں ہیں اور جنھیں قدرت کے عجائب خانے میں شاید ہمارے سیر تماشے اور عبرت کے لیے رہنے دیا گیا ہے۔ ہم بھی: برقعے، پان دان، قلیان، بدھنے، قدمچے کو اپنی تہذیب کے دائمی جلوے سمجھنے لگیں، تو تماشا بن کر رہ جائیں گے۔

خذ ما صفا دع ما کدر بھی ہماری تہذیب کے دائمی ورثے میں شامل ہے، نیز یہ کہ در مع الدھر کیف دار"۔[۴۸]

(۱۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی راست فکر اور مثبت رویوں کے نقاد ہیں۔ انھوں نے شخصی اور ذاتی نوعیت کے مسائل میں الجھنے کے بہ جائے، تہذیبی اور ثقافتی مسائل کی نقاب کشائی کے لیے ادب اور تنقید کے میڈیم کو برتا۔ تنقید کی اصطلاح ان کے نزدیک بالکل ان عمومی معنوں میں مستعمل نہیں، جن معنوں میں اسے برتنے کا رواج عام ہے، بل کہ ان کے نزدیک یہ ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں ادب، کلچر، فکر اور تہذیب کے فکری خدوخال اپنی تمام تر جمالیاتی رنگارنگی کے ساتھ عکس انداز ہوتے ہیں۔..... انھوں نے ایک جانب تنقیدی شعور کو تاریخی جہت عطا کی، تو دوسری طرف اس کا تہذیبی پیرایہ اس کے معنوی کینوس کا ترجمان ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کی تنقید میں ایک تخلیقی اور وجدانی جہت نمایاں ہے۔ وہ اپنی تحریر کو فکری آہنگ اور جمالیاتی ترنگ عطا کرتے ہیں، جس سے تنقیدی شعور اپنے طرزِ احساس اور اُسلوبِ اظہار کی بنا پر دل کش ہو جاتا ہے۔ ان کی تنقید اپنے تخلیقی رچاؤ کی بنا پر ایسی رعنائی اور رنگینی کو بڑھاوا دیتی ہے کہ ان کا اُسلوبِ نگارش ایک ایسی ادبی چاشنی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں دوامی رویے متشکل ہو جاتے ہیں۔ وہ زبان کی علامتی اور تخلیقی حیثیت کا بے پناہ شعور رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں خیال اور لفظ کی یک جائی زبان کے علامتی آہنگ میں منضبط ہوتی ہے، تو خیال: لفظ کے آنگن میں اتر کر عروسِ معانی کے اتنے زاویے ترتیب دیتا ہے کہ ادب کی تعبیر یک رخی اور اکہری سطح پر رونما ہونے کے بہ جائے متنوع جہتوں میں عکس انداز ہو جاتی ہے۔

جالبی صاحب کی تنقیدی زبان: سادگیٔ بیان اور رعنائیٔ خیال سے مرکب ہے۔ اس میں طرزِ ادا کا حسن بھی ہے اور طرزِ احساس کی کوملتا بھی۔ وہ اپنی زبان کو بوجھل نہیں بناتے، بل کہ اسے زندگی کی معنویت سے قریب تر رکھنے کا جتن کرتے ہیں۔ ان کی زبان حسنِ تخلیق کی رنگینی سے اظہار کے رنگ کشید کرتی ہے۔ وہ حتی الوسع حشو و زوائد سے احتراز کرتے ہیں۔ ابلاغ اور ترسیل کے اوصاف ان کی نثر کو وہ خوشبو عطا کرتے ہیں کہ احساس کی بوقلمونی نئے رنگ و آہنگ کی نوید بن جاتی ہے۔ ان کا اُسلوب فنی نزاکتوں کا امین ہے۔ ان کی نثر بہت ترشی ترشائی اور بنی سنوری ہوتی ہے، مگر اس پر آورد کا گمان نہیں ہوتا۔ وہ نہایت سلیقے اور قرینے سے اپنے فکری اور جمالیاتی آہنگ کو معنویت کا حسن عطا کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی فکری اور معنوی بنیادیں حسنِ اظہار کے قرینوں سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کا اسلوب ان کے تخلیقی شعور سے پھوٹتا ہے اور ان کی نثر اپنے اندر فکر و فلسفے کے امتزاجی رویے کی ایک ایسی دنیا بسائے

ہوئے ہے، جو ہماری تہذیب کی جمالیات اور اس کے معنوی نظام سے مرتب ہوتی ہے اور ان کی نثر: خیال انگیزی اور اچھوتے زاویہ ہائے نظر سے تخلیقی آہنگ کے دائرے میں شعریت اور دل کشی کے کتنے ہی منظر اُجال رہی ہے۔

> ''نثری تحریر میں اگر وہ افسانوی نہ ہو، تو خیال پر توجہ دینی چاہیے...... ایک عہد کے دو نثر نگاروں کا اگر موازنہ کیا جائے، تو وجہِ امتیاز صرف لفظ نہیں، بل کہ خیال ہونا چاہیے۔ خیال کی اکائی جملہ یا قضیہ ہوتا ہے، لیکن خیال ایک منطقی سیاق یعنی دلیل و حجت چاہتا ہے اور اس طرح خیال کی حقیقی اکائی ایک دلیل ہو جاتی ہے، لیکن لکھنے والا خیال کی وضاحت کے لیے بیان کو طول دیتا ہے اور ایک خیال اور ایک دلیل ایک پیراگراف تک پھیل جاتے ہیں۔ نثری اُسلوب اس اعتبار سے شعری اُسلوب سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک جگہ ایک مصرع اور شعر پیشِ نظر رہتا ہے، تو دوسری جگہ ایک عبارت؛ ایک پیراگراف اور خیال کی اظہار آرائی پر توجہ دی جاتی ہے۔ جب جالبی صاحب اپنی تنقید کو اپنے عصر کے دوسرے نقادوں کی تحریروں سے ممیّز کرتے ہوئے اسے فکری تنقید کہتے ہیں، تو اس سے ان کی مراد تخلیقِ ادب اور انتقادِ ادب کے پیچھے فکری سوتوں کی تلاش ہوتی ہے۔ ان کے سامنے محولہ بالا سوال رہتا ہے کہ اس تحریر سے کیا نیا شعور پیدا ہوا؛ سوچ کی نئی راہیں روشن ہوئیں؟ جالبی صاحب کی ناقدانہ تحریر گویا محض الفاظ کی خوبی سے نہیں، بل کہ لفظ کے معنی سے سروکار رکھتی ہے اور جالبی صاحب کے لیے معنی کا تعین سماجی رویوں سے ہوتا ہے''۔[۴۹]

ان کی نثر میں اظہار کے متنوع رنگ اور آہنگ عکس انداز ہوتے ہیں۔ اس میں ناتمامی اظہار کی محرومی نہیں ملتی۔ وہ رواں دواں نثر لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں حسنِ خیال اور صداقتِ احساس کی رنگارنگی کو بیان کرنے کا سلیقہ ایک ایسے یقین اور اعتماد سے پھوٹتا ہے، جو ان کی شخصیت کے داخلی تجربوں کی لطافت کا امین بھی ہے اور ترجمان بھی۔ ان کا اُسلوب ان کے شخصی رنگ رس سے متشکل ہوا۔ فکری نظام کی بوقلمونی ان کے ہاں ایسے توانا اور زندہ اُسلوبِ اظہار میں ڈھلتی ہے کہ بیان کا وفور خود ہی طرزِ ادا کی رنگینی کو سمیٹ لیتا ہے۔ ان کے اُسلوب میں تسلسل کا رنگ: اظہار کے معنوی اور جمالیاتی آہنگ سے عبارت ہے۔ ان کا جملہ اپنی صرفی اور نحوی ساخت کے اعتبار سے اردو کے اسالیبِ نثر سے ذرا مختلف اور کسی قدر ہٹ کر تخلیقی لباس سے مزیّن ہوتا ہے۔ یہ انفرادیت مجھے تو کسی شعوری کاوش کا نتیجہ

معلوم ہوتی ہے، جو انھوں نے اپنے جملے کی ساخت کو اردو کے اسالیب سے بچانے اور اسے نیا آہنگ عطا کرنے میں برتی ہے۔ جملہ سازی کے عمل میں وہ اردو کے صاحب طرز اُسلوب نگاروں کے برعکس، انگریزی زبان کے نام ور شاعر اور نقاد ٹی ایس ایلیٹ کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے جس قدر محنت اور ژرف نگاہی سے ایلیٹ کے مضامین کا ترجمہ کیا، شاید اس وجہ سے ان کے ہاں جملہ سازی اور اسلوب پر ایلیٹ کا اثر نمایاں ہوا ہو۔ [☆۱] بہ ہر حال کچھ بھی ہو، ان کا جملہ اپنے فنی اور ہیئتی تناظر میں منفرد نوعیت کا حامل ہے۔ جملہ سازی کی یہ انفرادیت ان کے اُسلوب کی انفرادیت کی دلیل بھی ہے اور توانائی کی ترجمان بھی۔ ان کا جملہ اپنے ہیئتی اور تکنیکی اُسلوب میں ایک ایسی ساخت وضع کرتا ہے، جو انھی سے مخصوص ہے۔ ان کی لفظیات سادہ، سہل اور روزمرہ زبان کی رنگارنگی کی غماز ہیں۔ وہ مشکل اور ادق خیالات کے اظہار میں بھی ادق اور گنجلک زبان کے استعمال سے احتراز برتتے ہیں۔ ان کی زبان اور اُسلوب پاکستان گیر جذبوں کا اظہاریہ ہے۔ وہ جملہ بنانے اور اسے سنوارنے کے ہنر سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ ان کی لفظیات: ان کے جملے کی ساخت سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ جملے کا معنوی اور جمالیاتی دروبست: لفظوں کے انتخاب اور نشست و برخاست سے ایک ایسی فضا تشکیل دیتا ہے، جو ان کے اسلوب کی ہمہ گیری کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ ان کے جملے کی ساخت: رعنائی خیال اور طرزِ احساس کی ان قدروں کی آئینہ دار ہوسکتی ہے، جو زبان کو اس کی شعریات کے تناظر میں تجزیہ کرنے سے ممکن ہوتی ہیں۔ زبان و بیان کے بدلتے ہوئے منظرنامے کی مجموعی فکری اور معنوی تعبیر کا ادراک کیے بنا یہ کلید ہاتھ نہیں آتی، کیوں کہ کسی بھی زبان میں جملے کی ساخت، اس کے داخلی دروبست کی تشکیل میں بنیادی کردار کی حامل ہوتی ہے۔ ایک جملے کی ترکیب سے زبان اور اس کا بدلتا ہوا آہنگ اپنی ہیئتی اور تکنیکی ساخت کی معنویت سے ہم کنار ہوتا ہے، یا اسے ہونا چاہیے، کیوں کہ زبان میں جملے کی ساخت اور اس کے تاریخی اور ارتقائی مراحل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ زبان کی رعنائی احساس کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور اس کی زندگی کی دلیل بھی!

ڈاکٹر جالبی کی نثر کا تمام تر اعجاز ان کے جملے کی ترکیب سے مرتب ہوتا ہے، کیوں کہ جملے کی ساخت ان کی تخلیقی اور فکری جہت کی آئینہ دار ہے۔ ان کے ہاں جملہ سازی کا عمل ایک ایسی جمالیاتی تکنیک سے پھوٹتا ہے، جو ان کی شخصیت کے داخلی اور خارجی رویوں سے عبارت ہے۔ ان کی نثر: ان کے جملے کی خوشبو سے خوش کن منظر کی تعبیر کے ذائقے سے آشنا ہوتی ہے اور جملہ اپنے آہنگ کے متنوع رنگوں سے۔ چند مثالیں دیکھیے کہ کس طرح ان کی زبان اور اُسلوب کی انفرادیت

جملہ سازی کے آہنگ سے مرتب ہوتی ہے:

(۱) ''میر کا فن محض آرٹ نہیں، بل کہ فائن آرٹ ہے، جس میں قدرتی بہاؤ کے ساتھ ساتھ قدرتی ٹھہراؤ بھی ہے۔ میر ایک ایسے گیت گانے والے شاعر ہیں، جو گیت کی صفات کو قدرتی صلاحیت اور فنی شعور کے ساتھ ملا کر پیش کرتے ہیں۔ غنائی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت غنا، یا موسیقیت ہے۔......... غنائی شاعری ذاتی انکشاف کی شاعری ہے۔ وہ درد جو شاعر کو بے تاب کر رہا ہے اور وہ مختلف قسم کے جذبے، جو اس کیفیتِ درد سے پیدا ہو رہے ہیں، اس پر ایک ایسا عالم طاری کر دیتے ہیں، جہاں الفاظ اپنے معانی اور غنا کے ساتھ اس کی خدمت کو پہنچ جاتے ہیں اور جذبوں کو ایک فنی صورت دے دیتے ہیں۔ میر عاشق ہیں، عشق کے کرب سے بے تاب ہیں، لیکن ان کا فنی ضبط اس میں توازن پیدا کر دیتا ہے۔ میر کے ہاں فنی سطح پر رومانیت کی انتہا پسندی اور کلاسیکیت کی پابندیوں کا ایک خوب صورت امتزاج ملتا ہے اور یہی توازن اور امتزاج میر کی شاعری کا کمال ہے۔'' [۵۰]

(۲) ''غالب کے مزاج میں طرزِ بیدل کو اختیار کرنے میں ناکامی اور ذاتی بے اطمینانی کی وجہ سے ایک نئی اکھاڑ پچھاڑ شروع ہوئی۔ شاہ راہِ عام سے ہٹ کر چلنے اور اپنے لیے ایک نیا راستہ نکالنے کی کوشش نے اور شدت اختیار کی، لیکن مروجہ تہذیبی روایت سے ہٹ کر نیا راستہ نکالنا کوئی ہنسی کھیل تو ہے نہیں کہ جس کے جی میں آئے، اپنا الگ راستہ نکالنے کی کوشش میں ایک دم الگ راستہ نکال لے۔ اس کا دارومدار تو تہذیبی روایت کی قوت یا کم زوری پر ہے، جس میں وہ زندہ ہے۔'' [۵۱]

(۳) ''میر کی شاعری میں جو تیور، جو لہجہ، جو رنگ اور غم و کرب کی، جو کیفیت نظر آتی ہے، اس کا تعلق اس کے عہد کے اس کرب سے ہے، جب مغلیہ تہذیب زوال کی طرف جا رہی تھی۔ عظیم تہذیب کی دیو ہیکل عمارت ملبہ بن رہی تھی اور اس دکھ میں سارا معاشرہ مبتلا تھا۔ میر نے اس دور کی زندگی کے دریا سے اس دکھ کو اٹھایا اور اپنی شاعری کی روح میں جذب کر دیا۔ اسی لیے میر اپنے دور کا

مقبول شاعر تھا۔ مقبول اس لیے کہ اس نے معاشرے کے باطن میں ہونے والے دکھ درد کو؛ اس کے کرب اور غموں کو، ان واقعات کے حوالے سے اس طرح بیان کیا کہ اٹھارھویں صدی کی روحِ حیات کی نبض پر میر کی انگلیاں جم گئیں۔ اس لیے میر اپنے دور کا ترجمان؛ اپنے دور کا نمایندہ شاعر ہے۔ اس کے اشعار میں اٹھارھویں صدی کے انسان کے لیے، ان واقعات کی طرف ایسے دردانگیز اشارے موجود تھے کہ میر کا شعر اس کے دل میں اُتر جاتا تھا۔" [۵۲]

(۱۲)

ڈاکٹر جالبی دھیمے اور نرم لب و لہجے کے نقاد ہیں، لیکن ان کی نرمی اور دھیما پن ان کے تنقیدی رویوں پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ تلاشِ حق میں کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے اور نہ ہی معروف اور چلتی پھرتی آرا ان کے تنقیدی وژن کو متاثر کرتی ہیں۔ وہ جو لکھتے ہیں، وہ ان کے حسنِ خیال کی آب و تاب سے ہم رنگ ہو کر اظہار کے قرینوں میں ڈھل جاتا ہے۔

ڈاکٹر جالبی کے تنقیدی سرمائے میں نظری تنقید کے رنگ بھی کھلتے ہیں اور عملی تنقید کا منظر نامہ بھی مرتب ہوتا ہے۔ نظری اور عملی رویے ان کے ہاں لخت لخت نہیں ہوتے، بل کہ باہم آمیخت ہو کر، ایک ایسی 'کل' تشکیل دیتے ہیں کہ جو ادب، یا ادب پارے کی تفہیم میں اساسی کردار ادا کرتی ہے۔

ڈاکٹر جالبی تخلیقی فن پارے کی اہمیت کے قائل ہیں۔ وہ کسی بھی فن پارے کے بطون میں اُتر کر اس کا تجزیہ کرنے اور اس کی وساطت سے فن کار تک پہنچنے کے قائل ہیں۔...... فن کار سے فن کی طرف سفر، ان کے ہاں نہیں ملتا۔ وہ ادب پارے کی داخلی جمالیات اور فکری تہذیب سے اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے اور اسے ایسی تعبیر عطا کرتے ہیں کہ زیرِ بحث ادب پارہ نئے معنوی اور فکری احساس کے ساتھ آشکار ہوتا ہے۔

(۱۳)

اعتدال اور توازن ان کی تنقید۔ کے وہ بنیادی اوصاف ہیں، جو ان کی فکر اور شعور کو ژولیدگی اور فرسودگی کے احساس سے صرف بچاتے ہی نہیں، بل کہ انھیں صراطِ مستقیم پر گامزن بھی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے فکری نظام کے اظہار میں کسی طرح کی پیچیدگی کو روا نہیں رکھتے۔ اعتدال: ان کے حسنِ خیال کو ابلاغ کی رعنائی سے معطر رکھتا ہے اور توازن: خیالِ حسن کی جمالیات کو روشنی کی وہ تعبیر عطا کرتا ہے، جو ثباتِ دوام کی

معنوی سچائی سے عبارت ہے۔تنقیدی رویوں میں اعتدال اور توازن کی ہم آہنگی: فکری بصیرت کو تہذیب اور ثقافت کے اس حقیقی تناظر میں آشکار کرتی ہے، جو ہماری ملی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ڈاکٹر انور سدید رقم طراز ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر جمیل جالبی کے عہد میں ادیب اور معاشرے کے طرزِ احساس میں ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی تھی۔ چناں چہ ان کے ہاں جن موضوعات نے زیادہ اہمیت حاصل کی، ان میں مختلف سماجی رشتوں کے تعین کا رجحان زیادہ نمایاں ہے۔ان موضوعات میں: **ادیب اور سماجی ذمہ داری، ادیب اور سیاست، ادیب اور حبِ وطن، شعور کی عینک، نیا ادب اور تہذیبی اکائی** وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب مباحث نظر ثانی نوعیت کے ہیں اور جمیل جالبی نے ان سب کو ایک ایسے مفکر کی آنکھ سے دیکھا ہے، جو منظر کے علاوہ پس منظر کو بھی اہمیت دیتا ہے؛ موجود سے ناموجود کی دریافت کرتا ہے اور ماضی کا سرا حال کے ساتھ ملاتا ہے، تو اسے مستقبل کی طرف لپکنے کا موقع بھی عطا کرتا ہے۔ ان تمام مباحث میں انھوں نے کلچر اور تہذیب کو فکری اساس کے طور پر استعمال کیا ہے اور تنقید کو اس آزادی کے ساتھ برتا ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر ان کے ہاں تنقید محض اظہار کا میڈیم نہیں رہتی، بل کہ ایک مقصد بھی بن جاتی ہے۔انھیں احساس ہے کہ بیسویں صدی میں سائنس نے فلسفے کو غیر اہم بنادیا ہے اور فلسفہ رفتہ رفتہ سائنس کی مختلف شاخوں میں تقسیم ہوکر بے معنی ہوتا جارہا ہے۔اس مشکل مرحلے پر جمیل جالبی نے وہ کام ادبی تنقید سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی، جسے ایک زمانے میں ادب اور فلسفہ الگ الگ سرانجام دیتے تھے۔'' [۵۴]

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید ان کے تصورِ تہذیب و ثقافت سے رنگ اور خوشبو کشید کرتی ہے۔وہ تنقید نگاری کے عمل میں ثقافتی مظاہر کی شناخت اور دریافت میں اتنی گہرائی تک اُتر گئے کہ ان کا سارا تنقیدی سرمایہ اسی زاویۂ نظر سے مرتب ہوا۔وہ ادب کو صرف ادب تک محدود نہیں رکھتے، بل کہ ادب، کلچر اور تہذیب کے مابین اکائی کو تلاشنے اور اُجالنے میں منہمک رہتے ہیں۔یوں کوئی بھی ادب پارہ اپنے فکری

اور تہذیبی تناظر میں اپنی اہمیت کا حامل بنتا ہے۔ پھر اس روح کی تلاش کرتے ہیں، جو کسی بھی تہذیب کے استحکام سے عبارت ہوتی ہے۔ وہ اس روح کے جمالیاتی آہنگ سے ادب پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں، تو صحیح نتائج نکالنے اور انھیں ٹھیک طرح مرتب کرنے میں کامگار رہتے ہیں۔ پورے اردو ادب میں تنقید لکھتے ہوئے، جالبی صاحب کے علاوہ کسی بھی دوسرے نقاد نے تہذیب اور کلچر کے مسائل کو تنقید نگاری کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ کلچر: ان کا بنیادی اور اساسی مسئلہ ہے۔ ان کے ہاں ادب کی پرکھ: تہذیب اور کلچر کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، کیوں کہ کوئی بھی فن پارہ تہذیب و ثقافت کی معنوی اساس کے بغیر نہ تو تخلیق ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ اور تہذیب سے مکالمہ

ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیق اور تدوین کی سنگلاخ وادی میں اُترے، تو نہ صرف اپنے لیے ایک منفرد راستے کا تعین کیا، بل کہ تازہ واردانِ بساطِ تحقیق کے لیے بھی نئے امکانات کے چراغ روشن کیے۔ وہ دنیائے تحقیق میں حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع اور مولانا امتیاز علی عرشی کے قبیلے کے فردِ فرید ہیں۔ انھوں نے جادۂ تحقیق پر چلتے ہوئے صداقتِ احساس اور تلاشِ حق کو اپنا ہدف ٹھہرایا۔ تحقیقی میدان میں حقائق کی تلاش اور متون کی بازیافت انھیں تاریخ کے چمن زاروں اور بے آب وگیاہ صحراؤں میں لیے پھری، مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور نہ ہی ان کے ذوق وشوق کے آنگن میں تھکن کی دھوپ اُتری۔ وہ آج بھی اسی طرح تازہ دم اور سرگرمِ کار ہیں، جیسے کہ اس وادیٔ شوق میں اُترتے وقت تھے۔ انھوں نے اپنے حوصلے اور ہمت کو جوان رکھا اور ان کے دم خم میں کوئی آنچ نہ آنے دی۔ انھوں نے اپنے لیے جو موضوعات چنے، وہ انھی کے ساتھ مخصوص ہو گئے؛ جن مسائل پر بھی دادِ تحقیق دی، ان میں امکانات کے در وا کر دیے۔ حق کی جستجو ان کا شعار رہا اور وقار بھی۔ بکھراؤ نہ ان کی شخصیت میں ہے اور نہ ہی تحقیق میں۔ وہ تاریخ کے مختلف ادوار میں سفر آشنا رہے، مگر بھٹکے نہیں۔ ان کی سفر پسندی انھیں تاریخ کے ایوان میں بہت دور تک لے گئی۔ وہ اردو ادب کی تحقیق میں خانقاہوں، درباروں اور بازاروں میں گھومتے رہے۔ انھوں نے جنوبی ہند میں دکنی اور ایرانی تہذیب کو معانقہ کرتے ہوئے بھی دیکھا اور تہذیبوں کے مابین ہونے والے مکالمات بھی سنے۔ سلسلۂ چشتیہ کی خانقاہوں میں سماع کی مجالس سے بھی کسبِ نور کیا اور دکنی بادشاہوں کی رزم اور بزم کا احوال بھی دیکھا۔ وہ رُکے نہیں، بڑھتے ہی رہے اور جب صدیوں کے سفر سے لوٹے، تو ان کا دامن رنگارنگ پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے حامل پھول ...... انھوں نے ان پھولوں کو اس طرح گلِ سرسبد میں پرویا کہ نہ ان کے رنگ ماند پڑے اور نہ خوشبو۔ خوش رنگی اور تازہ کاری کا، جو وصف پھولوں میں تھا، وہ ان کی تحریر میں بھی موجزن ہوا۔ وہ اردو زبان وادب کی گم شدہ کڑیاں تلاشتے رہے اور تاریخ بنتی رہی۔ انھوں نے ادب اور اس کے رجحانات، پر تاریخ سے مکالمہ کیا۔ یہ مکالمہ ان کے سینۂ دل پر نزول کرتا رہا اور وہ اسے

دل کے کانوں سے سنتے رہے۔ زمانہ گزرتا رہا اور اس مکالمے نے ایک کہانی کا پیکر اوڑھ لیا۔ اب یہ کہانی ہے اور ڈاکٹر جمیل جالبی .... وہ برسوں سے یہ کہانی سنا رہے ہیں۔ رات بھیگ چکی ہے اور کہانی موڑ پر موڑ کاٹتی ہوئی ایک نئے حیرت کدے میں داخل ہو رہی ہے:

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

تاریخ کی یہ کہانی نئی بھی ہے اور اچھوتی بھی۔ اس میں تلاش اور جستجو کے رنگ بھی ہیں اور حیرت اور تجسس کی خوشبو بھی۔ یہ رنگ اور خوشبو پھیلتے ہوئے کتنے ہی زمانوں کو محیط ہیں۔ ان کے اس مطالعاتی سفر کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

☆ تاریخِ ادبِ اردو [جلد اوّل]
☆ تاریخِ ادبِ اردو [جلد دوم۔ حصہ اوّل]
☆ تاریخِ ادب اِردو [جلد دوم۔ حصہ دوم]
☆ تاریخ ادب اِردو [جلد سوم]

[۲]

ابتدا سے انیسویں صدی کے نصف اوّل تک کا ادبی اور تہذیبی منظر نامہ تاریخِ ادبِ اردو کے تناظر میں لو دے رہا ہے۔ اس میں کتنے ہی ادوار اور زمانوں کی بو باس رچی بسی ہے۔ مسعود سعد سلمان لاہوری [م: ۵۱۵ھ] سے اس کہانی کا آغاز ہوا، پھر ایک سلسلہ سا چل نکلا۔ ڈاکٹر جالبی تاریخ کے ہر موڑ پر رُکے اور تاریخ کے ساتھ مکالمہ کیا۔ انھوں نے کلیت کی تشکیل میں جزئیات کے تانے بانے سے وہ رنگ رس سمیٹا کہ ادب و شعر کی گم شدہ کڑیاں جڑ کر ایک اکائی کی صورت میں متشکل ہوئیں۔ انھوں نے آب دیدہ اور کرم خوردہ مخطوطات کی سیر دیکھی؛ نامانوس الفاظ اور رسم الخط کی بھول بھلیوں میں سفر آشنا رہے؛ تاریخ کے اوراق اُلٹے؛ جغرافیے کی کتابوں کا مطالعہ کیا، تب کہیں جا کر 'مصرعہ تر' کی صورت پیدا ہوئی۔ انھوں نے اپنے مطالعاتی افادات: تحقیق و تدقیق کے زریں اصولوں کی روشنی میں پرکھے۔ وہ روایت سے زیادہ درایت کے حامی رہے۔ انھوں نے مروج نظریات کا مطالعہ: اصل اور بنیادی مآخذ کے تناظر میں کیا اور یوں صحیح اور درست منظر نامے کی تشکیل میں کامگار ہوئے۔ انھوں نے ریزہ ریزہ حقائق تلاشے اور پھر انھیں جوڑ کر تاریخ کے چوکھٹے میں پرو دیا۔ وہ اندھیروں میں سفر کرتے رہے، لیکن صدیوں کے فاصلے پر جلتے چراغوں کی لو انھیں بھٹکنے سے بچاتی رہی۔ وہ اردو بولنے والے قافلوں کے

ساتھ مغرب سے شمال اور شمال سے جنوب کی طرف سرگرمِ سفر رہے۔ وہ ہر اس ہاٹ بازار میں گئے، جہاں اردو میں لین دین ہو رہا تھا؛ انھوں نے مکتبوں اور خانقاہوں میں ڈیرا لگایا؛ دور دراز سے سفر کر کے کسی صوفی کے حجرے میں آنے والوں کو بھی دیکھا اور ان کی رام کہانی بھی سنی۔ صوفیہ کی خانقاہیں چوں کہ اس تہذیب اور معاشرے کا مرکزی مقام تھیں، اس لیے ہر سمت سے آنے والے مختلف راستوں کے راہی، اس گھنیرے سائے میں رُکتے، سکون کی دولت سے شاد ہو کر، اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ڈاکٹر جالبی ان کی گفتگو سنتے اور زبان کا مزاج متعین کرتے رہے۔ وہ دور دیس سے آنے والے راہیوں اور مسافروں کی زبان سے مخصوص لفظوں اور ان کے معنوی تنوع کو کشید کرتے اور ان سے لہجوں کی ساخت پرداخت کا اندازہ لگاتے رہے۔......اور یوں صدیوں پہ پھیلے اس ادبی، فکری اور تہذیبی منظر نامے کو کھوجنے اور پرکھنے میں کامیاب ہوئے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے الفاظ میں:

"جمیل جالبی صاحب ادب کو بنیادی طور پر ایک تہذیبی مظہر سمجھتے ہیں اور انھوں نے تاریخِ ادب لکھتے ہوئے اس نکتے کو مسلسل پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہ ہر عہد کے ادبی رجحانات کو مختلف تہذیبی عوامل سے مربوط دیکھتے ہیں۔ اس طور پر یہ تاریخ محض تاریخی واقعات وحقائق تک محدود نہیں رہتی، بل کہ ایک فکری دستاویز بن جاتی ہے۔ ایک مفصل تاریخ میں اپنے فکری نقطۂ نظر کو تسلسل کے ساتھ قائم رکھنا مشکل مرحلہ تھا، جس سے جمیل جالبی صاحب نہایت متوازن انداز میں عہدہ برآ ہوئے ہیں۔" [۵۴]

ڈاکٹر جالبی ہند اسلامی تہذیب کے نبّاض بھی ہیں اور رمز شناس بھی۔ انھوں نے اس تہذیب کی روح کی تلاش اور اس کی معنوی اور جمالیاتی اقدار کی بازیافت کا فریضہ انجام دیا۔ اس تلاش اور باز آفرینی کا حاصل ان کی **تاریخِ ادبِ اردو** ہے، جس کا ہر صفحہ تاریخی آثار کے تسلسل اور تواتر پر گواہ ہے۔ یہ صرف مستند اور معیاری کتاب ہی نہیں، بل کہ خود سند اور معیار ہے۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے کہ جس پر دوسری ادبی تواریخ کو پرکھ کر، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی رقم طراز ہیں:

"جالبی صاحب کی محنت اور جان کاہی کا نچوڑ **تاریخِ ادبِ اردو** کی تین [؟] جلدوں کی صورت میں منظر عام پر آیا، جس میں اردو زبان کے آغاز سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک کا اردو ادب تاریخی تواتر اور تحقیقی تفحص کے ساتھ

متعارف کرایا گیا ہے۔اردو ادب کی تاریخ لکھنے کی اب تک جتنی بھی سنجیدہ کاوشیں منظر عام پر آئی ہیں، ان میں سے صرف اسی کتاب کو مستند اور معیاری تسلیم کیا گیا ہے۔''[۵۵]

[۳]

تاریخ صرف ہمارے گزرے ہوئے کل کی آئینہ دار نہیں ہوتی، بل کہ اس میں ہمارے آنے والا کل بھی صورت پذیر ہوتا ہے؛ یہ محض ماضی کی بازیافت نہیں ہوتی، یا کم از کم اسے نہیں ہونا چاہیے، اس میں اگر ہمارے حال کی خوشبو شامل نہ ہو، تو پھر مستقبل کی اقدار کا تعین ماضی کے پس منظر میں ممکن نہیں ہوتا۔ماضی کی بازیافت پوری تہذیب کی بازیافت کے مرادف ہوتی ہے، اس کا تذکرہ معنی آشنا بھی ہوتا ہے اور معنی آفریں بھی۔یہ محض واقعات کا مجموعہ یا حالات کا کوائف نامہ نہیں ہوتی، اس میں تہذیب کی خوشبو اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ آشکار ہوتی ہے، تب کہیں جا کر اس کی روح سے مکالمہ ممکن ہو پاتا ہے۔اس میں معلومات کے اعداد و شمار سے بھی کام نہیں بنتا اور جمع تفریق کا ریاضیاتی عمل بھی اس کی توقیر کا باعث نہیں ہو سکتا۔یہ ماضی کے آثار کی اس تہذیبی جمالیات سے عکس انداز ہوتی ہے، جو اس کے سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور ادبی اقدار کو ایک نکتے پر رکھ کر دیکھنے اور ان کے معنوی نظام کے تعین میں معاون ہو۔

ادبی تاریخ: عام تاریخ سے ویسے بھی خاصی مختلف اور بعض معاملات میں بالکل منفرد قدروں کی عکاس ہوتی ہے۔ادب کا تہذیبی مطالعہ پوری تہذیب، کے فکری سرمائے کو اس کے جمالیاتی نظام کے تناظر میں پرکھنے سے عبارت ہوتا ہے، کیوں کہ ادب اور زبان ہی کسی تہذیب کے ترجمان ہوتے ہیں اور اس کی شناخت اور پہچان کی کلید بھی۔کوئی بھی تہذیب نہ تو سیاسی احوال سے منعکس ہوتی ہے اور نہ ہی معاشی طرزِ زیست سے۔یہ صرف ثقافتی اور معاشرتی قدروں سے بھی دریافت نہیں ہوتی۔اس کی پہچان کا واحد اور بنیادی ذریعہ ادب شناسی ہے، کیوں کہ ادب کے منظر نامے میں سیاست اور سماجیات کے رنگ بھی بکھرتے ہیں اور معاشرت اور ثقافت کے پھول بھی کھلے ہوتے ہیں۔ادب: تہذیب کے تمام تر رنگوں کا عکاس اور اس کی خوشبو کا غماز ہوتا ہے۔ایک بڑے خطے میں پھیلی ہوئی تہذیب کی خوشبو کو سمیٹنا بہت مشکل ہوتا ہے، کیوں کہ یہ تہذیب مختلف علاقوں کے ثقافتی، معاشرتی اور لسانی اثرات سے مملو ہوتی ہے۔

صدیوں پر محیط ہند اسلامی تہذیب کی باز آفرینی مختلف علاقوں اور زمانوں تک پھیلے ہوئے فکری اور جمالیاتی آثار کی بازیافت اور اس کے تجزیاتی آہنگ سے مرتب ہوتی ہے، تب کہیں پوری تہذیب کے فکری اور معنوی خدوخال سے آگاہی ممکن ہو سکتی ہے۔تہذیب: فرد اور معاشرے کی باہمی یک جائی اور

ان کے ربط وضبط کی داستان سے عبارت ہے۔ اس پر مذہبی تفکر اور روایت کا سایہ جتنا گھنیرا ہوتا ہے، تہذیب اتنی ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔ کسی بھی قوم کے مادی اور روحانی رویے اور اس کا ادبی اور فکری نظام اس کی تشکیل میں ممد و معاون ہوتا ہے۔

[۴]

ادبی تاریخ: عمومی تاریخ کے برعکس ادب اور اس کے مد و جزر اور لسان و اسالیب کے بدلتے رنگوں اور زندگی پر اثر انداز ہوتے موسموں کی عکس گری سے مرتب اور متشکل ہوتی ہے۔ اس میں معاشرتی اور ثقافتی آہنگ بھی اپنی لے چھیڑتا ہے اور فکری اور معنوی نظام بھی، مگر صرف ادب کے تناظر اور اس کے منظرنامے میں! اس میں خیال کی وسعت اور احساس کی گہرائی کے رنگ پورے معاشرے کے رنگ و آہنگ کو اپنی صورت پذیری کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے رنگ اور ان کے اثرات جتنے نمایاں، واضح اور ہمہ جہت ہوتے ہیں، تاریخی تناظر میں ادب اتنا ہی آفاقی اور ہمہ گیر قدروں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادبی تاریخ کے منظرنامے پر، مختلف علاقوں اور موسموں کے پرندوں کی چہکار اس تہذیب کے نظامِ رنگ و آہنگ اور حرف و صوت کی صورت اور احساس کو اوڑھ کر ایک ایسی آواز کو تشکیل دیتی ہے، جو تہذیب کی آواز بن جاتی ہے۔ اس کے سُر تال میں اس تہذیب کا ماضی، اس کی فکری اور روحانی اقدار بھی آن براجتی ہیں، تو اس آواز کے پس منظر میں، دور دیسوں کے پرندوں کی چہکاریں بھی نمایاں ہوتی ہیں اور ایک طرز میں ڈھل کر ایک آہنگ بھی مرتب کرتی ہیں۔ یہ آہنگ اس تہذیب اور اس کی قدروں کا نقیب بھی ہوتا ہے اور ترجمان بھی اور اسی آواز سے اس تہذیب کو سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے، لیکن اس آواز [جو تہذیب کے بطون اور مظاہر کی امین ہوتی ہے] کی شناخت اور ترجمانی بہت مشکل کام ہے۔ آواز کے تناظر میں کسی تہذیب کے داخلی اور خارجی خد و خال اور رنگ و آہنگ تک رسائی جس بصیرت اور آگہی کا تقاضا کرتی ہے، وہ ہر مؤرخ اور تاریخ دان کا مقسوم نہیں ہوتی۔ ادب کی تاریخ کو تہذیب کے فکری اور جمالیاتی اقدار کے پس منظر کو دیکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا......... انھی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔

ڈاکٹر جالبی اپنی تاریخ کے آنگن میں ایسے ہی ادبی مؤرخ کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ آواز یا آوازوں کی وحدت سے تہذیب کا اندازہ کرتے ہوئے، انھوں نے شعرا اور ادبا کی آوازوں سے ہند اسلامی تہذیب کے بطون میں جھانک کر، اس کی مجموعی قدر و قیمت کا تعین کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ میں تاریخ ادبِ اردو کا مطالعہ کرتے ہوئے، جب مختلف ادوار اور مختلف خطوں میں شعر و ادب سے وابستہ شعرا کی آوازیں سنتا ہوں، تو بے اختیار ڈاکٹر صاحب کو

داد دینے کے لیے جی مچلنے لگتا ہے۔ انھوں نے کس طرح مختلف اور متنوع آوازوں سے اس تہذیب کی بنیادی آواز کو سمجھنے کا قرینہ مرتب کیا۔ میں آوازوں کی اس لے کاری اور ان کے سُر تال کے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر، جب ان کے انفرادی رویوں پر غور کرتا ہوں، تو مجھے سلسلۂ چشتیہ کی خانقاہوں سے اُبھرتی ہوئی سماع کی آواز اس طرح اپنے حصار میں لیتی ہے کہ میں ہاٹ بازار اور اس کے ساتھ ساتھ دربار میں اٹھتی ابھرتی آوازوں کا تعین نہیں کر پاتا، تو تاریخ اٹھالیتا ہوں، جو آوازوں کے جنگل میں آواز کی وحدت کے اس الاپ کی وجود پذیری کا منظر نامہ مرتب کرتی ہے، جو ہند اسلامی تہذیب کی شناخت بھی ہے اور علامت بھی۔

ڈاکٹر صاحب کی اس آواز شناسی اور اس کے پردے میں تہذیب شناسی پر مجھے ایک کہانی یاد آتی ہے، جو اچھوتی بھی ہے اور پُر معانی بھی!

کہتے ہیں: چین کے ایک قدیم بادشاہ کو اپنے ولی عہد کی تعلیم و تربیت کا خیال آیا، تو اس نے اسے رموزِ جہاں گیری سکھانے کے لیے اپنے گرو کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ اس کی ایسی تربیت کی جائے کہ یہ حکمرانی کے انداز سیکھ لے۔ گرو نے اس لڑکے کو جنگل میں بھیج دیا کہ وہاں جا کر، وہ مختلف آوازوں کے مابین تفاوت کو محسوس کرے۔ ایک سال کے بعد، وہ لڑکا واپس آیا اور کہا کہ میں جنگل کے سارے پرندوں، جانوروں اور درندوں کی آوازیں نکالنے اور ان کے مابین فرق کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ گرو نے اس کی تعلیم کو ناقص قرار دیتے ہوئے اسے مزید ایک سال کے لیے جنگل میں بھیج دیا۔ اگلے برس جب وہ واپس آیا، تو کہنے لگا: میں طلوع اور غروب ہوتے سورج کی آواز سن سکتا ہوں؛ مجھے کلیوں کے ہنسنے اور پتیوں کے مسکرانے کی آواز آتی ہے؛ مجھے دن اور رات کے طلوع اور غروب کا اندازہ ان کے قدموں کی چاپ سے ہوتا ہے؛ میں بدلتے موسموں کے رنگوں اور خوشبوؤں کی آواز سنتا ہوں۔ یہ سن کر گرو نے اسے بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا اور بادشاہ کو لکھا: یہ ماضی سے مکالمہ کر سکتا ہے۔ اسے تہذیب کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ زمانے کے دل کی دھڑکن اسے اپنے دل کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔ اب اس پر ہر قسم کا بوجھ ڈالا جا سکتا ہے، یہ کبھی ناکام نہیں ہوگا۔

تاریخِ ادبِ اردو پڑھتے ہوئے یہ کہانی مجھے بار بار یاد آتی ہے کہ کیسے صدیوں کے سینے سے آتی آوازوں میں تفاوت کر کے ڈاکٹر جالبی نے تہذیب کی آواز کو سنا اور اس کی معنویت کو پھیلا کر تاریخِ ادب کے دامن میں سمو ڈالا۔ وہ پنجاب سے دکن اور دکن سے شمالی ہند کے میدانوں میں گھومتے شعرا اور ادبا کی آوازوں کے رنگ تلاشتے رہے۔ مختلف ادوار کی آوازوں کا تعین کرتے ہو۔ ہر تہذیب کی معنوی اور جمالیاتی صوت اور آہنگ کی تلاش میں کامگار رہے۔

تاریخِ ادبِ اردو تہذیب کی انھی آوازوں کی یکسانیت اور تفاوت سے پھوٹی ہے۔ وہ ہر آواز کے

سرگم اور سرتال کو ادوار کی آوازوں کے سنگم میں سموتے اور اس سے مختلف ادوار کی آوازوں کی لے دریافت کرتے رہے، پھران ادوار کی لے اور سُر تال کو تہذیب کی آواز میں ملا کر ایک وحدت اور اکائی کی صورت میں اُبھرتے نغمے کو یک جائی عطا کی اور یوں تہذیبی تناظر میں ادب کے جمالیاتی سُروں کو مرتب اور ہم آہنگ کیا۔

[۵]

تاریخ کے دامن میں بکھرتی ہوئی متنوع آوازیں کو ثقافتی تناظر کی جمالیات میں تجزیہ کر کے، انھیں تہذیبی وحدت کے معنوی آہنگ میں مرتب کرتے ہوئے، ڈاکٹر جالبی نے **تاریخ ادبِ اردو** میں اس طرح سمودیا کہ ادب کی تاریخ بالکل ایک نئے اور منفرد ذائقے سے آشنا ہوئی۔ زمانے کے بدلتے موسموں میں ثقافتی اور جمالیاتی لہروں کے تموج کو ایک ایسی تعبیر عطا کی، جو فکری اور معنوی صداقت کی آبرو بن گئی۔ ادبی تاریخ کو انھوں نے حقائق کی معنویت کا اعتبار بخشا، تو تاریخ کے پس منظر میں ادب وشعر کے نگینے جگمگا اٹھے۔ تاریخ کے سمندر میں اٹھتی موجیں گہر ہائے آب دار کی خبر لاتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان موتیوں کو سمیٹ کر، تہذیب کے منظرنامے پر ادب کی صورت گری کے وہ مناظر تخلیق کیے کہ مختلف ادوار سے متعلق شعرا ہمیں اپنے عہد کی بھرپور اور پُرمعنی جمالیات کے پس منظر میں دکھائی دینے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہند اسلامی تہذیب کے تناظر میں، اردو ادب کی روایت کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے زبان کی ساخت پرداخت کے منظرنامے سے لے کر، ادب کے آغاز وارتقا تک کے پیش نامے کا تجزیہ کیا۔ وہ عہد بہ عہد بدلتے معنوی منظرنامے کی کڑیاں جوڑتے رہے اور یوں انھیں ایک وحدت کی صورت عطا کی۔ انھوں نے ادبی تاریخ کی تشکیل اور تہذیب میں محض ادبی رویوں کے بدلتے ہوئے خدوخال ہی کو نہیں دیکھا، بل کہ انھیں تہذیبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی اقدار کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کا جتن بھی کیا۔ وہ ادب سے تہذیب فہمی اور تہذیب سے ادب شناسی کا فریضہ انجام دیتے رہے اور تاریخ کے تناظر میں تہذیب کی کلّی معنویت اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ آشکار ہوتی رہی اور تہذیب کے آئینے میں ادب کا چہرہ اپنی بہار دکھاتا رہا۔ جالبی صاحب اس منظرنامے سے خوشبو کشید کرتے رہے۔ انھوں نے تہذیب اور ادب کے امتزاجی مطالعات سے وہ روح تلاشی، جو وحدت کی صورت میں اس تہذیب میں محوِ سفر تھی اور زندگی کا سارا شعور اسی کے حوالے سے منضبط ہو رہا تھا۔ انھوں نے ادب کے آنگن میں تہذیب کے اُترتے اور بکھرتے رنگوں کو سمیٹا اور انھیں اکائی کی صورت میں مرتب کیا۔ یہی وہ صداقتِ احساس ہے، جو رنگوں کی اس دنیا سے تشکیل پاتی ہے، جو اپنے اندر صدیوں کا منظرنامہ سمیٹے

ہوئے ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے ماضی کی تلاش میں تہذیبی سرچشموں کو فراموش نہیں کیا، اسی لیے ان کے ہاں تہذیب اور ثقافت کے دائرے: ادب اور تنقید کے دائروں سے مل کر ایک 'کل' بناتے ہیں اور یہی 'کل' ماضی کے اندھیروں سے ہوتا ہوا، مستقبل کے سویروں تک پھیل جاتا ہے۔ ماضی اور مستقبل کی چہرہ نمائی میں، وہ حال کے پیش منظر کو گم نہیں ہونے دیتے، بل کہ اسے ایک نقطۂ اتصال کی صورت میں متشکل کرتے ہیں کہ جہاں ماضی اور مستقبل کے تال میل سے کلچر شناسی کا ایک نیا باب طلوع ہوتا ہے۔

[۲]

تاریخِ ادبِ اردو انیسویں صدی کے نصف اوّل تک کے علمی، ادبی اور تہذیبی منظرنامے کا ایک اظہاریہ ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے ادب کی تاریخ کے قدیم اور گم شدہ سرچشموں کی تلاش اور جستجو سے شناخت اور پہچان کے کتنے ہی منظر تخلیق کیے۔ وہ رعنائی احساس اور صداقتِ خیال کے تناظر میں ماضی کی تفہیم کے پیش منظر اُجالنے میں کامگار رہے۔ انھوں نے پنجاب سے دکن اور پھر دکن سے شمالی ہند کے مختلف اور متنوع خطوں میں پھیلتی اردو زبان و ادب کی ترویج اور ارتقا کے کتنے ہی موسموں کے رنگ رس کشید کیے۔ انھوں نے تاریخ کے تناظر میں تہذیب اور ادب کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور کس طرح اس کی آبیاری کی؟ ان سوالات کا جواب **تاریخِ ادبِ اردو** کی معنوی فضا سے لطف اندوز ہوئے بنا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ ادبِ اردو کا مطالعہ ہند اسلامی تہذیب کے سیاسی، سماجی، ادبی اور معاشرتی منظرنامے کے تناظر میں کیا۔ انھوں نے مختلف زمانوں میں پھیلے ہوئے اردو ادب کے سرمائے کو ٹکڑوں میں بانٹنے کے بہ جائے اسے اکائی کی صورت عطا کی اور پھر اس کی معنوی اور جمالیاتی فضا کی تعیین میں اس فکری ارتباط سے اخذ و استفادہ کیا، جو ادبی تاریخ کے آہنگ کو تہذیبی اور معاشرتی رنگ میں دیکھنے سے عبارت ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''واضح رہے کہ یہ جدید انداز کی مربوط تاریخ ہے؛ متفرق مقالات کا مجموعہ یا تذکرہ نہیں ہے۔ جدید ادب کی طرح، قدیم ادب بھی مخصوص تہذیبی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی و لسانی عوامل کا منطقی نتیجہ تھا، اسی لیے اس کا مطالعہ بھی تہذیبی و معاشرتی عوامل کی روشنی میں ویسے ہی کیا جانا چاہیے؛ جیسے آج ہم جدید ادب کا کرتے ہیں۔ ادب کی تاریخ ایک ایسی اکائی ہے، جسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ خود جدید ادب کو سمجھنے کے لیے قدیم ادب کا سمجھنا ضروری ہے۔ ادب کی تاریخ وہ آئینہ ہے، جس میں ہم زبان اور اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی و تہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے
میں پیوست ہو کر ایک وحدت؛ ایک اکائی بناتے ہیں اور تاریخِ ادب ان
سارے اثرات، روایات، محرکات اور خیالات و رجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔
میں نے اسی شعور اور نقطۂ نظر سے قدیم ادب کا مطالعہ کیا ہے۔" [۵۶]

جالبی صاحب نے تاریخ کے منظر نامے میں تہذیب اور ادب کے نئے در وا کیے۔ انھوں نے دیدہ ریزی سے قلمی مخطوطات کا مطالعہ کیا اور ان کے بطون میں پوشیدہ معارف سے وحدت کی تشکیل کے نئے اور تازہ منظر اُجال دیے۔ تہذیب کی اجتماعی فکری اور جمالیاتی روح کی جزئیات سے کلیات کا پیکر تراشا اور ماضی کے انکشاف کی ایک نئی روایت رقم کی۔ انھوں نے پوشیدہ حقائق کا سراغ بھی لگایا اور ان کی چھان پھٹک کر کے ایسے منطقی نتائج مرتب کیے، جو ادبی روایت کے تسلسل کے امین بھی ہیں اور ان کے باہمی ربط وضبط کے آئینہ دار بھی۔ تحقیق آثار کی تلاش و جستجو کے عمل میں ان کا تنقیدی شعور بھی بیدار رہا۔ انھوں نے روایت کے تسلسل اور تواتر کی عکس گری میں، تحقیق و تنقید کے اشتراک اور امتزاج سے ایک ایسا منظر مرتب کیا کہ شمالی اور جنوبی ہند میں اردو زبان اور ادب کی ایک مکمل تصویر جلوہ گر ہوئی۔ انھوں نے نہ تو چند حقائق کو لے کر ان پر 'کُل' کا حکم لگایا اور نہ ہی 'کُل' کو من و عن تسلیم کیا، بل کہ کُل کے تناظر میں ادب کی روایت اور تسلسل کو اپنے تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھا اور پھر ان کی معنویت کا تعین کیا۔ انھوں نے علاقائی زبانوں کے اثرات کی بھی نشان دہی کی اور عربی و فارسی کے اثرات کا بھی تجزیہ کیا۔ ہندوی زبان کی تشکیل اور روایات میں جو بھی لسانی عناصر اور عوامل موجود رہے، ڈاکٹر صاحب نے ان کا مطالعہ کیا۔ ان عناصر کے اثر و نفوذ اور ربط و ضبط کی آویزش اور آمیزش سے جو معنوی ڈھانچا متشکل ہوا، اس کے تجزیاتی آہنگ سے بھی وہ غافل نہیں رہے۔ اس تجزیاتی عمل میں وہ زبان کی ہر کروٹ اور اس کی ہر انگڑائی کے شاہد رہے۔ فکر و فرہنگ کی روایت میں انھوں نے ایسے نقش اُبھارے کہ زبان کا لسانی مطالعہ سائنسی اُسلوب اور تاریخی تناظر میں آشکار ہوا۔ مشفق خواجہ کے بہ قول:

"جالبی نے اردو زبان کی تشکیل کے ابتدائی نقوش کا سراغ لگانے کے بعد ادبی روایت کی مختلف کڑیوں کو ملانے اور اس روایت کے پھلنے پھولنے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو ادب مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا اور مختلف خطوں میں محصور نظر نہیں آتا۔ اس تاریخ میں ادب ایک ایسا دھارا ہے، جو بدلتے ہوئے حالات کے تحت کہیں آہستہ خرام ہے اور کہیں تیز رو۔ یہ دھارا خطِ مستقیم کی صورت میں نہیں، بل کہ مختلف سمتوں میں بہتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور اس کا تسلسل کہیں ختم نہیں ہوتا۔ اردو ادب کی تاریخیں لکھنے والوں نے ادبی روایت کے تسلسل کو نظر

انداز کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ ہمیشہ پابندِ مقامات رہی ہے اور ہر مقام کی ادبی روایات جُداگانہ ہیں۔ جمیل جالبی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ کو ایک ایسا مجمع الجزائر نہیں سمجھا، جس کے جزیرے ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ انھوں نے ادبی روایت کے تسلسل کا سراغ لگایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ جو مسعود سعد سلمان سے شروع ہوتی ہے اور ولی اور ان کے معاصرین تک پہنچتی ہے، ایک مسلسل سفر سے عبارت ہے۔'' [۵۷]

مسلسل سفر: زندگی اور حرکت کی علامت ہے۔ یہ اس شعور کا آئینہ دار ہے، جو زبان کے آنگن میں بیدار ہوتا اور فکر و خیال کے آئینہ خانے میں پروان چڑھتا ہے۔ سفر کے تسلسل اور شعور کی بیداری میں ایک قدرِ مشترک: طرزِ احساس کی تشکیل بھی ہے، جو جذبے کی آغوش میں پل کر، فکر اور تجربے کے اظہارات میں ڈھل جاتی ہے۔ زندگی اور اس کے رویوں کا بامعنی اظہار زبان کی نیرنگی سے عبارت ہوتا ہے۔ زبان: خیال کے تموج اور مشاہدات و تجربات کی رنگا رنگی کو ایک ایسے منظرنامے میں مرتب کرتی ہے کہ فکری نظام کی چھوٹ سے انسانی شعور کے در و بام جگمگا اٹھتے ہیں۔ زبان: انسانی تجربات اور شعوری احساسات کے رنگ میں پلتی اور اس کی خوشبو کے تناظر میں پھیلتی ہے؛ یہ صدیوں کے تہذیبی عوامل سے برگ و بار لاتی اور اپنے خدوخال اُجاگر کرتی ہے۔ زبان اپنی تہذیب اور کلچر کی ترجمان ہوتی ہے اور تہذیب اور کلچر اس کے اظہار کا فکری سرمایہ، کیوں کہ زبان کے دریچے کسی بھی تہذیب کے فکری اور جمالیاتی آنگن میں کھلتے ہیں اور تہذیب: زبان کی علامتوں میں اپنی چہرہ نمائی کرتی ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی اپنی تہذیب اور اس کے ثقافتی مظاہر کی آئینہ دار ہے۔ یہ زبان ہند اسلامی تہذیب کے اس مشترک فکری سرمائے کو اپنی روح میں سموئے ہوئے ہے، جو تہذیبوں کے باہم مکالمے سے عکس انداز ہوا۔ اسلامی تہذیب کے ہند میں ورود سے قبل اردو کا ہیولیٰ موجود تھا، مگر یہاں کی مردہ اور زوال پذیر معاشرتی اور تہذیبی زندگی اس کی نمو میں اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے جہاں تہذیبی سطح پر نئے پھول کھلے، وہیں اس میں نئے اور تازہ رنگ و آہنگ بھی نمایاں ہوئے۔ ڈاکٹر جالبی رقم طراز ہیں کہ:

''مسلمانوں کا کلچر ایک فاتح قوم کا کلچر تھا، جس میں زندگی کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹنے کی پوری قوت اور لچک موجود تھی۔ اس کلچر نے جب ہندوستان کے کلچر کو نئے انداز سکھائے اور یہاں کی بولیوں پر اثر ڈالا، تو ان بولیوں میں سے ایک نے، جو پہلے سے اپنے اندر جذب و قبول کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھی اور

مختلف بولیوں کے مزاج کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی، بڑھ کر اس نئے کلچر کو
اپنے سینے سے لگایا اور تیزی سے ایک مشترک بولی بن کر نمایاں ہونے لگی۔
دیکھتے ہی دیکھتے اس بولی نے اس کلچر کے ذخیرۂ الفاظ کو اپنا لیا اور اس کے طرزِ
احساس اور نظامِ خیال سے ایک نیا رنگ روپ حاصل کر لیا اور اس طرح وقت
کے تہذیبی، معاشرتی و لسانی تقاضوں کے سہارے مسلمانوں اور برِ عظیم کے
باشندوں کے درمیان مشترک اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بن گئی۔ زبان کا بیج جان
دار تھا؛ زمین زرخیز تھی؛ نئے کلچر کی کھاد نے ایسا اثر کیا کہ تیزی سے کونپلیں
پھوٹنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک تناور درخت بن گیا۔" [۵۸]

اردو زبان اور اس کا طرزِ احساس تہذیب کی رنگا رنگی سے متشکل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو کے لسانی عناصر کی تجزیاتی اپیل کو ہند اسلامی تہذیب کے فکری اور معنوی نظام سے کشید کیا۔ انھوں نے اس کے عہد بہ عہد بدلتے رنگوں سے اس کی حقیقی اور دوامی زندگی کا راز اور تہذیب کی تخلیقی روح کا عرفان تلاش کیا کہ کس طرح اردو کا تخلیقی آہنگ جذبے کی سچائی اور تجربے کی رعنائی سے ضیابار ہوا اور یہ زبان ایک بولی ٹھولی کی سطح سے اٹھ کر ایک تہذیب اور اس کے ثقافتی مظاہر کی علامت بن گئی اور اس کے وجود کی انفرادیت نمایاں ہوئی۔ ان کے نزدیک اس زبان کا خمیر نہ تو کسی مخصوص علاقے کا مرہونِ منت ہے اور نہ ہی کسی خاص زبان کا، بل کہ یہ ہند و پاکستان کے مختلف علاقوں اور ان میں مروج زبانوں کی خوشبو سے معطر رہا۔ اس پر عربی، ترکی اور فارسی کے زندہ اور توانا اثرات بھی مرتب ہوتے رہے، تب کہیں جا کر اس کے اُسلوب میں رعنائی اور اس کے طرزِ احساس میں زیبائی پیدا ہوئی۔ یہ زبان مختلف تہذیبوں کے باہمی اختلاط اور مکالمہ آرائی سے پروان چڑھی اور آخرِ کار ہند اسلامی تہذیب کے نظامِ خیال کی آئینہ دار ٹھہری۔ اس کے فکر و فرہنگ کی ہمہ گیری اور آفاقیت اس کی زندگی اور توانائی کی عکاس ہے۔ اس کے دامن کا پھیلاؤ: اس کی وسعتِ نظری اور گہرائی احساس کا آئینہ دار رہا۔ عوام کے ساتھ ربط و ضبط اور خانقاہی نظام کے ساتھ عقیدت اور ارادت نے اس کے گھر آنگن میں وہ پھول کھلائے کہ یہ زبان ہر زمانے کے حلقۂ تخلیق کو متاثر کرتی رہی۔ اس کا تہذیبی شعور اور ثقافتی آہنگ: اس کی زندگی کا ترجمان رہا۔ اپنے امتزاجی مزاج کی بدولت جب بہ قولِ ڈاکٹر جالبی:

"نئے لہجے اور تلفظ اس میں شامل ہوئے؛ نئی آوازوں نے اس زبان کے سوئے
ہوئے تاروں کو چھیڑا، تو اس کے اندر ایک ایسا عملِ امتزاج شروع ہوا، جس نے
اس میں سڈول پن پیدا کر کے نرمی، شائستگی اور قوتِ اظہار کو بڑھا دیا۔ رفتہ رفتہ
یہ زبان نئے لفظوں کی مدد سے اپنا رنگ روپ اور چولا بدلنے لگی۔ بے ڈول، ان

گڑھ، ثقیل اور قدیم آوازوں والے الفاظ خود بہ خود خارج ہوتے گئے اور نئی تہذیبی و معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے والے الفاظ داخل ہوتے گئے۔ یہ وہ مثبت، دوررس اور گہرا اثر تھا، جو مسلمانوں کی فتح نے، تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ، اس برِ عظیم کی زبان پر ڈالا۔" [۵۹]

جب اردو تخلیقی آہنگ سے آراستہ ہوئی، تو تہذیبی زندگی میں رعنائیِ خیال کے آثار ہویدا ہوئے، فکر و آہنگ کا منظر نامہ لو دینے لگا؛ نظامِ خیال کی بوقلمونی اظہار کے رنگ بدلنے لگی؛ جذبہ و احساس شیر و شکر ہو کر اس کے وجود میں ڈھلنے لگے، تو معاشرتی زندگی ایک نئے تخلیقی دور میں داخل ہوئی۔ زمانے نے انگڑائی لی اور یہ نئے تخلیقی وفور اور فلسفۂ حیات کی خوشبو سے جاگ اٹھا؛ بے معنویت کا احساس جاتا رہا؛ زبان نئے لسانی امتزاج سے ہم رنگ ہوتی گئی اور اس کا ادبی سرمایہ بڑھتا رہا۔

[۷]

ڈاکٹر جالبی نے تاریخِ ادبِ اردو میں اس لسانی امتزاج کی تجزیاتی اپیل اور ادبی سرمائے کی بازیافت کا فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے مسعود سعد سلمان کے عہد سے لے کر، انیسویں صدی کے نصف اوّل تک کے ادبی منظر نامے کی بو باس کو تہذیبی زندگی کی رنگارنگی کے تناظر میں مرتب کیا، تو فکر و فرہنگ کی کومل اور سجل فضا ایک نئے معنوی آہنگ سے آشنا ہوئی۔ وہ زبان کی تشکیل اور تہذیب کے سلسلے میں شعر و ادب کی ترویج اور روایت کی معنویت کے متلاشی رہے۔ انھوں نے ادب کا تہذیب کے پس منظر اور پیش منظر میں مطالعہ کیا اور جو مباحث چھیڑے، وہ اپنی فکری اور معنوی جمالیات کے اعتبار سے نہایت فکر انگیز ہیں۔ مشفق خواجہ کے بہ قول:

> "...........اردو زبان و ادب کے ارتقا کی اس داستان کو ایک ایسے مؤرخ کی حیثیت سے بیان کیا ہے، جو زبانوں کی نشو و نما کے اصولوں سے واقف ہے، جو زبانوں کے مد و جزر سے آشنا ہے، جسے تہذیب و ثقافت اور اس کے مظاہر سے پوری طرح آگاہی ہے اور جسے یہ معلوم ہے کہ زبان کا ادبی دھارا وقت اور ماحول کی تبدیلی سے کس طرح اپنا رخ بدلتا ہے۔" [۶۰]

جمیل جالبی نے تاریخِ ادبِ اردو کے تناظر میں ایک نئے جہانِ معنی کی خبر دی، جس کی طنابیں صدیوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے ادب کے فکری اور معنوی نظام کا مطالعہ ایسے انداز سے مرتب کیا، جو ہمارے لیے بالکل نیا بھی ہے اور تازہ بھی۔ سائنسی اور تاریخی اندازِ تحقیق سے انھوں نے ادب کا زمانی منظر نامہ تشکیل دیا، تو کتنے ہی گم شدہ ادبی خزینے زمانے کی اوٹ سے جلوہ گر ہوئے۔ قدیم

ادب کے غیر مطبوعہ سرمائے سے اخذ واستفادہ کرکے، انھوں نے کتنے ہی شاعروں کو حیاتِ تازہ کی نوید دی؛ کتنے ہی نئے آثار دریافت کیے۔ ان کی تاریخ میں پہلی بار ہم ادبی تاریخ کے صحیح اور درست معنوی تناظر سے آگاہ ہوئے۔ یہ گنجینۂ معنی: علم وادب کی خوشبو کے کتنے ہی رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کی خوبیاں اس کی مقبولیت کی آئینہ دار بھی ہیں اور اس کی زندگی کی نوید بھی۔ **تـــاریـخِ ادبِ اردو** کی خصوصیات کا ایک اجمالی منظرنامہ مرتب کرتے ہیں، تاکہ اس کے رنگوں کی بہار اپنے معنوی اور جمالیاتی رنگوں کے ساتھ آشکار ہو سکے:

(۱) **تاریخِ ادبِ اردو** وہ نگارخانہ ہے، جس میں ہند اسلامی تہذیب اپنے تمام تر رنگوں کے جمالیاتی آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ ادب اور ادبی تاریخ کے تناظر میں تہذیب اور ثقافت کی خوشبو رچی بسی ہے۔ انھوں نے قدیم اور جدید ادب کی جلوہ آرائی میں سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تاریخی عوامل سے اغماض نہیں برتا، بل کہ ان کے پس منظر سے تہذیب اور ثقافت کے آثار کی جلوہ آرائی کے رنگ سمیٹے اور پھر ان رنگوں سے انھوں نے ادب کے منظرنامے کی تشکیل اور تہذیب کی۔ یوں ہمارا ماضی ہمارے حال اور مستقبل کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا۔ ادبی ورثے کی خوشبو: تہذیبی اور ثقافتی مظاہر کے ساتھ ہم آہنگ ہوئی۔ ثقافت اور تہذیب کے امتزاج سے وہ ادبی اقدار کی تلاش اور جستجو میں سرگرمِ کار رہے، اس طرح انھوں نے ماضی کو بھی اُجالا اور مستقبل کے منظرنامے کا بھی سراغ لگایا۔ کلچر اور ادب کے امتزاجی آہنگ سے وہ لے مرتب کی، جو قدیم اور جدید ادب کے مابین ایک اکائی کی صورت میں موجود ہے۔ وہ کسی بھی شاعر کا مطالعہ اس کے عہد کی تمام تر فکری اور جمالیاتی رعنائیوں کے تناظر میں مرتب کرتے ہیں۔ یوں شاعر ایک وحدت کی صورت میں اپنے تہذیبی آثار کے ساتھ ہم رنگ ہو کر سامنے آتا ہے۔ بہ قولِ یونس احمر:

> ''ہمارا ادبی ورثہ دراصل تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے ہم آہنگ ہے۔ جب ہم میر اور غالب، سودا اور میر درد کی شاعرانہ عظمت کی باتیں کرتے ہیں، تو ساتھ ہی ہماری آنکھوں کے سامنے اس عہد کی تہذیب بھی آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے مختلف ادوار کے ادبی ورثے کے ساتھ ساتھ اس تہذیب اور ثقافت کا بھی جائزہ لیا ہے، جس کے پس منظر میں ہمارا ماضی دعوتِ نگاہ دے رہا ہے۔''[۲۱]

(۲) ادب کی تفہیم کے ضمن میں ڈاکٹر جالبی تہذیب اور تاریخ کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں، اس لیے ان کے ہاں ثقافتی آثار کی بنیادی حیثیت ہے۔ وہ تہذیب شناسی کے بغیر ادب شناسی کا تصور نہیں

کرسکتے، کیوں کہ جب تک تہذیبی وحدت اپنی تمام تر فکری اور جمالیاتی معنویت کے ساتھ منکشف نہ ہوجائے، ادب کو سمجھنا تو درکنار اس کی معمولی تفہیم بھی نہیں ہوسکتی۔ معاشرتی اقدار کی پسپائیت اور ان کا کھوکھلا پن تہذیبی منظرنامے سے عدم تعلق اور عدم آشنائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں اکائی صرف اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہے، جب ہم تہذیب کی حقیقی معنویت کا ادراک کرسکیں۔ تہذیب اپنی معنویت کا ادبی اور فکری تناظر میں اظہار کرتی ہے۔ ہماری معاشرتی زندگی کو جس طرح سے متضاد رویوں کا سامنا ہے، اس کی بنیادی وجہ تہذیب اور ثقافت کی عدم تفہیم ہے۔ اگر کسی قوم پر اس کے تہذیبی اور ثقافتی آثار اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ منکشف نہ ہوں، تو اس کی ادبی معنویت کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر جالبی نے اس نکتے کی ہمہ گیریت کو تاریخ کے صفحات میں منعکس کرنے کی سعی کی۔ انھوں نے ثقافتی مظاہر کے تناظر میں ادب کی تفہیم کا ایک ایسا امتزاجی رویہ تشکیل دیا، جو ادب اور اس کی معنویت کو اس کے مجموعی فکری منظرنامے میں مرتب کرتا ہے اور اس کی تفہیم کے متنوع رنگوں سے عبارت ہے۔

(۳) **تاریخ ادبِ اردو** کلچر، فکر اور تاریخ کے امتزاج اور ان کے باہم مکالمے سے صورت پذیر ہوئی۔ کلچر، فکر اور تاریخ کی یہ مثلث تہذیب کے بنیادی ستونوں سے مرتب ہوتی ہے۔ ان کے جمالیاتی تناظر میں ادب کا انکشاف ایک ایسا وجدانی زاویہ مرتب کرتا ہے کہ جس کی رعنائی، اس کے تہذیبی طرزِ احساس سے رنگ کشید کرتی ہے۔ انھوں نے کلچر، فکر اور تاریخ کے امتزاج اور ان کی معنوی وحدت سے ادب اور ادبی اقدار کو تلاشنے اور ان کی جمالیاتی رنگارنگی کا سراغ لگانے کا فریضہ انجام دیا۔ وہ کلچر کو فکر اور تاریخ کے تناظر میں پرکھتے اور پھر ادبی اقدار کے امتزاج سے اس اکائی کی خوشبو تلاشتے ہیں، جو ان میں معنوی اور فکری یک جائی کی امین ہے۔ متنوع فکری اور جمالیاتی جہتوں میں امتزاج اور یک جائی ڈاکٹر صاحب کے فکر و فن کا بنیادی وصف ہے۔ وہ اس امتزاجی نقطۂ نظر سے مختلف اور رنگارنگ اشیا کے مابین وحدت اور اکائی کی وہ روح ڈھونڈ لیتے ہیں، جو کسی بھی تہذیب کی زندگی اور اس کی رعنائیوں سے مملو ہوتی ہے۔ وہ ادبی روایت کی تفہیم، تہذیب کے اس تصورِ حقیقت سے منکشف کرتے ہیں، جو فکری اور جمالیاتی وجدان سے عبارت ہے اور یوں ان کا مطالعاتی آہنگ: کلچر، فکر اور تاریخ کے تخلیقی زاویے کے ساتھ مل کر تہذیبی وحدت کی معنویت کا عکاس بن جاتا ہے۔ اس سے ادبی اقدار کے رنگ بکھرتے اور خوشبو کے وہ دائرے متشکل ہوتے ہیں، جو تاریخ کے آنگن میں ادب کی تخلیق اور تہذیب کے متنوع زاویے تشکیل دیتے ہیں۔ اس سے تاریخ: ادب کے صحیح تناظر میں معنوی احساس کی کوملتا سے مل کر، اس کی تعبیر کے نئے اور اچھوتے سلسلے عکس انداز کرتی ہے اور یہی زاویے جب

تــاریخِ ادبِ اردو کے صفحات پر جلوہ آرا ہوتے ہیں، تو ان کی رعنائی کا احساس ہی اس کے امتزاجی آہنگ کا ترجمان بن جاتا ہے۔

(۴) تــاریخِ ادبِ اِردو میں ڈاکٹر صاحب نے جس طرح ادب کا تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر مرتب کیا، وہ اس کی معنویت کا ایک جداگانہ اور منفرد اُسلوب مرتب کرتا ہے۔ انھوں نے ادب کی تفہیم اور اس کی اکائی کی تلاش کو تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی آثار کے متنوع اور کسی قدر مختلف زاویوں میں دیکھا اور اس کی تعبیر اس کے فکری پس منظر میں ترتیب دی۔ ادب کے پہلو بہ پہلو تہذیبی رنگارنگی کے جملہ مظاہر کی کارفرمائی نے ادب کی تفہیم اور تعبیر کو نئے قرینے عطا کیے اور ادبی منظر نامہ تہذیبی افکار کی اوٹ سے جلوہ نما ہوا۔ وہ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی طرزِ احساس سے ادب کی معنویت اور اس اکائی کی تاریخ مرتب کرتے ہیں، تو ادب کی جمالیاتی بوقلمونی کا متنوع آہنگ سامنے آتا ہے، جو ادب کو اس کے تمام تر فکری رنگوں میں منعکس کرنے سے عبارت ہے۔ وہ ادبی تاریخ اور اس کے درست معنوی تناظر سے آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ: تہذیبی افکار کی رنگارنگ امتزاجی صورت گری کے باوجود ادبی اقدار کی جلوہ نمائی کو متاثر نہیں کرتی، بل کہ اس کے رنگ رس میں اضافے کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ جس طرح کسی بھی عہد کا تہذیبی اور تاریخی پس منظر مرتب کرتے ہیں، اس سے وہ عہد اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنی عصری روح کو آشکار کرتا ہے۔ پھر اس عصری حسیت اور اس عہد کی تہذیبی وحدت میں، ادب کی صورت گری کے متنوع اور مختلف مراحل کا تجزیہ کرتے ہیں، تو اس عہد کی روح، اس کے ادبی تناظر میں جگمگا اٹھتی ہے۔

(۵) تــاریــخِ ادبِ اردو متصوفانہ نظام اور روحانی اقدار کی خوشبو سے معطر ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے جہاں اردو ادب کی فکری اکائی کی تفہیم اور تہذیب میں: تہذیب کے سیاسی، سماجی، معاشی نظام ہائے فکر سے استفادہ کیا، وہیں پر انھوں نے تہذیب کے روحانی اور وجدانی نظامِ تصوف کی روح کو بھی سمیٹنے اور اس کی معنویت کو منکشف کرنے سے اغماض نہیں برتا۔ انھوں نے اردو زبان کی سفر آشنائی اور بادیہ پیمائی کے رنگوں کو خانقاہ کے نظامِ اقدار کی روشنی میں منعکس کیا۔ ڈاکٹر جالبی نے اردو کی داستان سناتے ہوئے لکھا کہ:

> ''صدیوں یہ زبان سر جھاڑ منہ پہاڑ گلی کوچوں میں آوارہ اور بازار ہاٹ میں پریشان حال ماری ماری پھرتی رہی۔ کبھی اقتدار کی قوت نے اسے دبایا، کبھی اہلِ نظر نے حقیر جان کر اسے منہ نہ لگایا اور کبھی تہذیبی دھاروں نے اسے مغلوب کر دیا۔ یہ عوام کی زبان تھی، عوام کے پاس رہی۔'' [۶۲]

اس زمانے میں عوام اور عوامی اقدار خانقاہی نظام سے وابستہ تھے۔ سلسلۂ چشتیہ کی خانقاہیں اپنی عرش مقامی اور عوام پروری میں معروف تھی۔ تصوف تہذیب کا بنیادی اور مرکزی ادارہ تھا۔ عوام کی طرح اردو کو بھی خانقاہوں میں چلہ کشی نصیب ہوئی، تو اس کے نصیب کھل اٹھے۔ گلی کوچوں میں آوارہ اور بازار ہاٹ میں پریشان پھرنے والی یہ گری پڑی زبان صوفیہ کی وساطت سے اس قدر زرخیز اور شاداب ہوئی کہ پھر برِ صغیر کی کوئی دوسری زبان اس کی مدِ مقابل نہ رہی۔ ڈاکٹر جالبی نے اس زبان اور اس کے ادب کو خانقاہی کلچر میں جس طرح پروان چڑھتے اور برگ و بار لاتے دیکھا، اسی طرح اس کی معنویت کو اُجاگر کیا۔ انھوں نے ادب کو تہذیب کے خارجی رنگوں کے ساتھ ساتھ تہذیب کے اس داخلی نظامِ فکر کی خوشبو سے بھی مشک بار کیا اور اس کی تفہیم اور تعبیر کے نئے اور اچھوتے آفاق بھی تلاش کیے۔

(۶) تاریخِ ادبِ اردو کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ:

''یہ تاریخِ ادب میری اپنی روح کا سفر ہے، جسے میں نے برِ عظیم کی تہذیبی روح کی تلاش میں کیا ہے۔ سفر جاری ہے اور میری منزل ابھی دور ہے۔'' [۶۳]

'اپنی روح کے سفر' کی یہ داستان 'برِ عظیم کی تہذیبی روح کی تلاش' سے عبارت ہے۔ ادب کی تعبیر و تفہیم میں عرفانِ ذات کی جلوہ آرائی کا یہ منظر نامہ تاریخِ ادب کی ایک منفرد مثال ہے۔ روح کے سفر کی تہذیبی روح اور اس کی اقدار کی تلاش کا عمل ایک ایسے زاویۂ نظر کو منکشف کرتا ہے، جو نفیِ ذات سے لے کر اثباتِ ذات تک کے جملہ مراحل کو محیط ہے۔ یہ سفر اپنے باطن کی دنیا کو خارج کے آہنگ سے مملو کرنے کا نام بھی ہے اور اپنی ذات کو تہذیبی اقدار کی روشنی میں اُجاگر کرنے سے عبارت بھی! اپنے دل کی دھڑکن کو تہذیب کی دھڑکن سے ہم آہنگ اور ہم رنگ کرنے اور پھر دونوں کی معنوی اقدار کی تلاش: خارج اور باطن کے مابین ایک ایسے نقطۂ اتصال کی تلاش اور جستجو بھی ہے، جو روح کے سفر کا منظر نامہ تہذیب کے خارجی اور باطنی مظاہر میں پھیلا دیتا ہے اور یوں:

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اُتر جائے

کا منظر نامہ ترتیب دیتی ہے اور روح کا سفر خارج سے باطن اور باطن سے خارج کے مظاہر میں محوِ سفر رہتا ہے۔ تہذیب آشنائی اور اس کے باطن میں سفر آرائی اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی، جب تک کہ کوئی فرد اپنی روح کی خوشبو کو تہذیب کے رنگ و آہنگ سے وابستہ نہ کردے۔

ڈاکٹر جالبی نے تاریخِ ادب کی ترتیب اور تہذیب میں اپنی روح اور اس کے تخلیقی سفر کے مکاشفات کو بھی شامل کیا۔ یوں مصنف کا روحانی اور وجدانی فکری منظر نامہ بھی تہذیب کی صداقت کے طرز

احساس سے مملو ہو گیا اور تاریخ: فرد اور تہذیب کے روحانی آفاق کی معنویت کی عکاس بن گئی۔ روح کے سفر میں تہذیب اور اس کے ادب کی اکائی کی تلاش: جذبۂ عشق کی بدولت ممکن ہو سکتی ہے، کیوں کہ مادی اور خارجی اسالیب: روح کے اس سفر کی داستان سرائی کو اپنے آہنگ کے پیکر میں منضبط نہیں کر سکتے، کیوں کہ یہ کہانی: وجدانی اور مکاشفاتی طرزِ ادا سے مزین ہو کر خوش آہنگ ہو سکتی ہے۔ بہ صورتِ دیگر یہ اکائی اور وحدت کے لباس میں ملبوس نہیں ہو پاتی اور تہذیب کا فکری اور روحانی سفر: ادب کے آنگن میں جلوہ آرائی سے محروم رہتا ہے، کیوں کہ جذبۂ عشق اور جذبۂ جنوں ہی اس کام کا محرک ہوتا ہے اور اس کا کیف اور وجدان ہی اس کی تحسین اور تعبیر کا باعث بن سکتا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''میرے جنوں اور علم و ادب کے عشق نے، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز کر کے، یہ جوئے شیر مجھ سے ہنسی خوشی کھدوائی ہے۔ یہ کام کر کے میں نے خوشیاں حاصل کی ہیں اور یہی میرا صلہ ہے۔'' [۶۴]

(۷) تاریخِ ادبِ اردو میں ڈاکٹر جالبی نے ادب کی ترویج اور ارتقا کے تجزیاتی مطالعات کے پہلو بہ پہلو زبان کے لسانی اور لسانیاتی مراحل کا بھی مفصل تذکرہ کیا۔ انھوں نے پنجاب، دکن، شمالی ہند اور پھر پاکستانی علاقوں میں زبان کی لسانی تبدیلیوں اور ان کے بدلتے موسموں کی خوشبو کا تہذیبی اور ثقافتی مظاہر کے تناظر میں تجزیہ کیا۔ انھوں نے سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کے اثرات اور زبان کے لسانی پہلوؤں پر ان کے اثرات کی نشان دہی کی۔ جلد اوّل میں تمہید کے عنوان سے انھوں نے اُردو زبان اور اس کے پھیلنے کے اسباب پر، مفصل روشنی ڈالی کہ یہ زبان کس طرح نمو پذیر ہوئی اور کن کن علاقوں میں اس کا چلن رہا؟ کن زبانوں سے اس نے خوشبو کشید کی اور ان کے ادب سے معنوی ہم آہنگی کے رنگ سمیٹے۔ اس حصے میں زبان کے پھیلتے آفاق کے معروضی اور تجزیاتی مطالعے سے انھوں نے جو نتائج مرتب کیے، ان کی خوشبو کو مختلف ابواب میں زیرِ مطالعہ شعرا کے لسانی تجربوں کی رعنائی اور رنگینی سے بھی ہم آہنگ رکھا۔ انھوں نے مختلف ادوار میں، مختلف معاشرتی اور سماجی منظروں کی تبدیلیوں کے تناظر میں زبان کے لسانی رویوں کے بنتے سنورتے روپ کی صورت آرائی کو بھی محفوظ رکھنے کا جتن کیا اور ان کے پس منظر میں تہذیب کی اس اکائی کو بھی تلاشنے کی کوشش کی، جو زبان کی وساطت سے اس کے علامتی اظہار کی ترجمان رہی۔ لسانی آہنگ سے تہذیبی قدروں کا سراغ لگانے اور اس کے ادب کی پرکھ پڑچول کا فریضہ بھی انجام دیا۔ انھوں نے ادب کی روایت کو لسانی عوامل کی تعمیر و تشکیل اور ان کے مابین ردِعمل کے مراحل کے اعتبار سے بھی سامنے رکھا، تا کہ زبان اور تاریخی حوالے سے لسانی پس منظر میں ادب کی روایت کا سفرنامہ مرتب اور متعین ہو سکے۔

(۸) تاریخِ ادبِ اردو میں، ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان و ادب کا مطالعہ مختلف علاقائی دھاروں

کوتہذیبی جزیروں میں مرتب کرنے کے بہ جائے تہذیب کی کلی اور اساسی اقدار میں متشکل کیا، اس لیے پوری تاریخِ ادب میں ایک معنوی وحدت دکھائی دیتی ہے، جو انھیں ٹکڑوں میں بانٹ کر، تجزیہ کرنے سے ممکن نہیں ہوسکتی تھی، کیوں کہ تہذیبی روح کی تلاش کا منظر نامہ اس کی اکائی کے اعتبار ہی سے متعین ہوسکتا ہے، اسے ٹکڑوں میں بکھیرنے سے نہیں۔ وہ جزئیات سے کلیت کی تفہیم کی معنوی فضا تیار کرتے ہیں، تو انھیں معنی کی تشکیل کے زاویے مرتب کرنے میں آسانی بھی ہوتی ہے اور نتائج کی درستی بھی صحیح تناظر سے ہم آہنگ رہتی ہے، جب کہ اس کے برعکس وہ تہذیبی روح کی کلی تعبیر تک رسائی نہ کرسکتے اور تاریخ کے صحراؤں میں گم ہوکر رہ جاتے؛ تاریخ کی کڑیاں بکھر جاتیں اور ان کا معنوی ارتباط ممکن نہ ہوسکتا اور **تاریخ ادبِ اردو** بھی سابقہ تاریخ ہائے ادب کی کتابوں اور تذکروں کے غبار میں گم ہوکر رہ جاتی، لیکن انھوں نے ادبی تاریخ کے صحیح اور درست تناظر کا ادراک کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں تہذیبی اکائی سے ادبی اقدار کا تعین کیا اور اپنے مطالعاتی افادات کو وحدت کے رنگ میں رنگنے اور اس کی اساسی معنویت کو اُجاگر کرنے کی طرح ڈالی۔ سید وقار عظیم رقم طراز ہیں کہ:

> ''ماضی میں ہم نے ادبِ اردو کی جو تاریخیں مرتب کی ہیں، ان سب کو یک جا کر کے اور ان کے مطالب و مانیہ کا تجزیہ کیا جائے، تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم نے ادب کی تاریخ کے نام سے جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی پورے ادب کو ایک ناقابلِ تقسیم اکائی یا تصور تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہ کتابیں یا تو نظم کی تاریخیں ہیں، یا نثر کی اور ان میں سے بعض اوقات ادوار اور موضوعات کی حد بندیاں کرتے ہوئے مطالعے کو یا تو ایک مخصوص دور تک محدود رکھا گیا ہے، یا نثر اور نظم کی کسی صنف تک۔ جہاں تک نظم یا شاعری اور اس کی اصناف کا تعلق ہے: **آبِ حیات، کاشف الحقائق، گلِ رعنا، شعر الہند، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، دلی کا دبستانِ شاعری، جدید اردو شاعری** [اور اس موضوع پر متعدد کتابیں]، نیز مثنوی، قصیدے، غزل، رباعی اور مرثیے کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق مختلف کتابیں اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ یہی صورت نثر کی ہے، جس میں: **اربابِ نثرِ اردو، سیر المصنفین، داستانِ زبانِ اردو، گل کرسٹ اور اس کا عہد** اور اس کے علاوہ داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح کی تاریخ اور ارتقا پر لکھی ہوئی متعدد کتابیں شامل ہیں۔ ان سب کتابوں میں ادب کسی نہ کسی حیثیت سے خانوں میں بٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ادب کی ان تاریخوں میں بھی

جنھیں پورے ادب کی تاریخ سمجھا جاتا ہے، تقسیم کا یہی غیر منطقی عمل کارفرما ہے۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخِ ادبِ اردو میں بھی نظم اور نثر کے حصے الگ الگ ہیں اور پنجاب یونی ورسٹی کی شائع کردہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک وھند کی پانچوں جلدوں میں بھی کہ جہاں بہ ظاہر اس تقسیم سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے، بالآخر یہی تقسیم غالب آگئی ہے اور اس کی سب جلدوں میں اوّل تا آخر جاری و ساری ہے۔ گراہم بیلی کی لکھی ہوئی مختصر تاریخ ادبِ اردو سے لے کر اس وقت تک اردو ادب کی جتنی مختصر تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں بھی پورا ادب ایک سالم اکائی کی طرح نہیں اُبھرتا۔ پھر اس بنیادی نقص کے علاوہ ان تاریخوں میں ترک و اختیار کا وہ محتاط امتیاز اور طول و اختصار کا وہ نازک توازن بھی موجود نہیں، جو طویل اور بسیط تاریخوں سے زیادہ مختصر تاریخوں میں ضروری ہوتا ہے۔" [۶۵]

(۹) تاریخ ادبِ اردو تحقیق اور تنقید کا خوب صورت امتزاج ہے۔ یہ امتزاجی اسلوب ڈاکٹر صاحب کی پہچان بھی ہے اور شناخت بھی۔ وہ تحقیق میں تنقید کے رنگ بکھیرتے اور تنقید میں تحقیق کی خوشبو کاشت کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تحقیق اور تنقید کی باہمی یک جائی اور ارتباط سے ایک ایسا اُسلوب جلوہ گر ہوتا ہے، جو اپنے اندر تخلیقی شان رکھتا ہے۔ ان کا یہ تخلیقی اسلوب ان کی تحقیق کو خشک اور بے مزہ ہونے اور ان کی تنقید کو بے راہ اور گم راہ ہونے سے بچاتا ہے۔ وہ تحقیقی نتائج کے استخراج اور ان کی معنویت کی عکس آرائی میں اپنے تنقیدی آہنگ سے جمالیاتی اقدار کا تعین کرتے ہیں اور تنقیدی اظہارات میں تحقیق اور اس کی جمالیاتی معنویت کی خوشبو بکھیر دیتے ہیں۔ یہ اسلوب بہت کم ہی محققین اور ناقدین کو نصیب ہوتا ہے کہ ان کا تحقیقی رنگ: تنقید کی خوشبو سے معطر ہو اور ان کی تنقید تحقیقی زاویہ ہائے فکر کی نوید بن جائے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے بہ قول:

"تحقیق کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تنقید بھی بہت سلجھی ہوئی ہے، بل کہ دل کش اور دل آویز ہے، نہ کہیں سختی ہے اور نہ کہیں جھول ہے اور ہر بات سے ان کے وسیع مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔" [۶۶]

یہ طرزِ احساس: حقائق کی باز آفرینی اور ان کے مابین تطبیق کی معنی آفرینی سے عبارت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس اُسلوب اور آہنگ سے تاریخِ ادبِ اردو میں وہ رنگ اور خوشبو کشید کی کہ تاریخ کی معنویت اپنے تمام تر فکری اور معنوی طرزِ ادا کے ساتھ سامنے آئی۔ اس طرزِ ادا کی امتزاجی صورت ان کی زبان اور بیان پر بھی اثر انداز ہوئی اور ان کے فکری اور معنوی آہنگ پر بھی۔

ڈاکٹر صاحب نے تحقیق اور تنقید کے باہمی ارتباط سے ایک نئی اصطلاح بھی متعارف کرائی، جسے انھوں نے ان دونوں کو جوڑ کر 'تحقید' کا نام دیا۔ انھوں نے 'تحقید' کے زیرِ عنوان جن شعرا اور ادبا کا مطالعہ کیا، ان کے ہاں تحقیقی مظاہر اور حقائق کی تعبیر کو بھی مطمحِ نظر بنایا اور ان کے تنقیدی اُسلوب کو بھی منعکس کیا۔ یہ اُسلوب تاریخ ادب اردو کے ہر صفحے پر ان کی امتزاجی شخصیت کا مرہونِ منت بھی ہے اور ان کے تخلیقی آہنگ پر گواہ بھی! مشفق خواجہ کے الفاظ میں:

> "تحقیق کے ساتھ ساتھ اس تاریخِ ادب کا تنقیدی معیار بھی بہت بلند ہے۔ جمیل جالبی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے مزاج کو تحقیق و تنقید دونوں سے یکساں مناسبت ہے۔ اسی بنا پر میرے نزدیک تاریخِ ادب لکھنے کا استحقاق ان سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔ یہ کام کوئی ایسا شخص صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا، جو محض محقق یا نقاد ہو۔ تحقیق کے ذریعے کسی شے کو تلاش کیا جاتا ہے اور تنقید کے ذریعے اسے پرکھا جاتا ہے؛ اس کی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے۔ اگر ادبی مؤرخ صرف محقق ہوگا، تو وہ اشیا کو تو تلاش کر لے گا، لیکن یہ نہیں بتا سکے گا کہ ان کی اہمیت ہے، تو کیوں؟ نہیں ہے تو کیسے؟ اور اگر تاریخ ادب لکھنے والا صرف نقاد ہوگا، تو اس کے لیے اس چیز کو تلاش کرنا ممکن ہی نہیں ہوگا، جس کی قدر و قیمت اسے متعین کرنی ہے۔ جمیل جالبی کی یہ خوبی ہے کہ وہ شے کو تلاش بھی کر لیتے ہیں اور اسے پرکھ بھی سکتے ہیں۔ ان کے ہاں تحقیق و تنقید ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تحقیق سے ان کی تنقید نکھرتی ہے اور تنقید سے ان کی تحقیق میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔" [٦٧]

(۱۰) اُسلوب: شخصیت کے داخلی اور خارجی رویوں کے اظہارات سے عبارت ہے۔ کوئی بھی شخصیت اُسلوب کے بطون میں سانس لیتی ہے اور اُسلوب اس شخصیت کے باطن سے پھوٹتا ہے۔ گویا شخصیت اور اُسلوب لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ دونوں کے مابین رچی بسی خوشبو ان کی حیاتِ دوام کا باعث ہوتی ہے اور ان کی یک جائی اور کلیت کی آئینہ دار بھی! نثری آہنگ میں لفظ اور معنی کی شعوری اور لاشعوری ترتیب اور تہذیب اس طرزِ احساس اور طرزِ ادا سے وابستہ ہوتی ہے، جو کسی بھی تحریر کو معنوی تہ داری اور حسنِ خیال کی رعنائی سے بھر دیتا ہے۔ کسی بھی صاحبِ طرز اُسلوب نگار کا اُسلوب اس کی تہذیب کی آواز سے ہم رنگ اور ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اس میں، اس کے زمانے کے فکری رجحانات منعکس ہوتے ہیں۔ صاحبِ طرز کا فن کدہ اپنے عصر کی منفرد اور اساسی آواز سے مربوط بھی ہوتا ہے اور اس کا ترجمان بھی۔ لفظوں کا ترک و اختیار اور ان کی معنوی رنگارنگی بھی عصری حسیت سے پھوٹتی ہے۔

لفظ کے پس منظر میں موجودہ تہذیب اس کے معنوی تعین اور اس کے پھیلاؤ کی علامت ہوتی ہے۔ تہذیب کے متنوع رنگ لفظ کے بطون میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

لفظ تہذیب کی اوٹ سے جب جلوہ نما ہوتا ہے، تو اس کی معنوی اپیل وسعت آشنائی کی دلیل بن جاتی ہے۔ لفظ کی تہذیب کے باطن میں سفر آشنائی اور اس کی مسلسل گردش کا راز اس کی معنوی ہمہ گیریت سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ تہذیبی احساسِ جمال کی علامت بھی ہوتا ہے اور اس کے معنوی جمال کا آئینہ دار بھی۔ اس لیے کسی بھی تخلیق کار کا معنوی آہنگ اس کے مزاج کی اشاریت سے رنگ رس کشید کرتا ہے۔ اس سے لکھنے والے کا مذاقِ سلیم بھی جھلکتا ہے اور روحِ عصر بھی اور یہ جبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ جب لکھنے والا اپنے عصر اور اس کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے باخبر اور ہم آہنگ ہو، کیوں کہ عصری طرزِ احساس سے واقفیت اور آگہی ہی اس کی تحریر اور اُسلوب کو روحِ عصر کی معنویت کا حسن عطا کرتی ہے۔ علمی تحریر کی زبان اگر کتابی اور تحریری زبان کے اثر سے ہٹ کر، گفتگو اور بول چال کی زبان کے آہنگ سے مملو ہو جائے، تو پھر اس کی تازگی اور شادابی کے اتنے رنگ بکھرتے ہیں کہ جن سے نثر: جمالیاتی اور تہذیبی احساسِ جمال سے مل کر، ایک نئے اور اچھوتے رنگ ڈھنگ کو جنم دیتی ہے۔ اس میں اظہار کی سادگی: رعنائی خیال سے بھی وابستہ رہتی ہے اور شاعرانہ آہنگ سے بھی اور یہ کرشمہ لفظ سے متشکل ہوتا ہے، جو خیال کو ایک پیٹرن اور رنگ عطا کرتا ہے:

> "لیکن جب جالبی صاحب الفاظ کو کثیر المفہوم کہتے ہیں، تو وہ الفاظ کو مختلف ابلاغی اور ثقافتی سطحوں پر عمل کرتا دیکھتے ہیں۔ ایک تو لفظ کے راست معنی ہیں، لیکن جب یہ لفظ دوسرے الفاظ کے ساتھ ایک خاص معنوی نشست میں ڈھلتا ہے، تو اس کے نئے معنی نکل آتے ہیں، جو اس کے راست معنی سے متصادم نہیں ہوتے۔ یہ خلطِ معنوی کا نہیں، بل کہ 'معنی توسیع پذیری' کا عمل ہوتا ہے، جو حقیقتاً سماجی اور ثقافتی تفہیم اور عصری آگہی سے عبارت ہے۔ الفاظ کی 'معنی توسیع پذیری' کا عمل ایسا ہی ہے، جس طرح مصوری میں رنگوں کی دمک کا پھیلاؤ نظر آتا ہے۔ جب ایک تحریری مصور رنگوں کے باہمی امتزاج سے تصویر بناتا ہے، تو اسے معلوم ہے کہ کتھئی رنگ کو سرخ کے ساتھ رکھ دیا جائے، تو اس کی دمک ماند پڑ جاتی ہے؛ سرخ کو سفید کے ساتھ رکھ دیا جائے، تو سرخ کھل اٹھتا ہے۔ جالبی صاحب کے یہاں الفاظ کی یہی صورت ہے۔ الفاظ کی معنی آفرینی کی ایک شکل ان کی باہمی نشست ہے اور ان کو سمجھنے کے لیے ہمیں جالبی صاحب کے تصورِ زبان کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ زبان جالبی صاحب کے

لیے سماجی رشتوں کی علامت ہے۔ ان رشتوں کا اور ان کی گہرائیوں کا شعور ادب وفلسفے میں اظہار پاتا ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ سماجی رشتے اور معاشرتی رویے کیا رخ اختیار کررہے ہیں، ایک معاشرہ کی زبان پر نظر ڈالنی چاہیے۔ اپنی تاریخ ادب اردو [جلد۲] میں وہ دریافت کرتے ہیں کہ ہندی معاشرے میں جہاں فارسی مستحکم ہوچکی تھی، اردو نے کیسے جگہ بنائی اور بتاتے ہیں کہ بدلتے ہوئے معاشرتی تقاضے نئے سماجی رشتوں کو جنم دے رہے ہیں۔" [۶۸]

تاریخِ ادبِ اردو ڈاکٹر صاحب کی برسوں کی ریاضت اور مطالعاتی افادات کا وہ ثمر ہے، جو فکری اور معنوی رعنائی کے اعتبار سے بھی منفرد اور ممتاز ہے اور طرزِ احساس اور اُسلوبِ اظہار کی رنگینی کے حوالے سے بھی۔ ان کی زبان: شگفتہ اور تازہ کار ہے اور اُسلوب: ندرتِ بیان اور حسنِ خیال کا استعارہ۔ جس طرح وہ خود خوب صورت شخصیت کے مالک ہیں، اسی طرح ان کا اُسلوب بھی رعنائی احساس کا مرقع ہے۔ وہ دل کش انداز سے ادب کی تفہیم کرتے ہیں۔ جیسے معاشرتی زندگی تہذیبی روح سے اپنی توانائی اور قوت کا حصول ممکن بناتی ہے، بالکل ویسے ہی ان کا اُسلوب بھی تہذیبی طرزِ احساس اور اس کی رعنائی سے اپنی تشکیل کی معنویت کشید کرتا ہے۔ ان کا اُسلوب ان کی شخصیت کے خارجی اور داخلی روپ سے جڑا ہوا ہے۔ اس میں داخل اور خارج کی دوئی یا ثنویت نہیں ملتی، بل کہ یہ دونوں روپ یک جا ہو کر تخلیقی رنگ کو مرتب کرتے ہیں، اس لیے ان کے ہاں فکر اور فن یک جا ہو کر ایک معنوی اکائی میں ڈھل جاتے ہیں، جیسے تحقیق: تنقید کے منظرنامے سے باہم آمیخت ہو کر 'تحقید' بن جاتی ہے۔ تحقیقی زبان کو ٹھس اور یبوست زدہ زبان سمجھنے والے اور تحقیقی اُسلوب کو بے مزہ اور ریاضیاتی اعداد وشمار کی زبان بنانے والے محققین ایک لمحے کے لیے اس محققِ عصر کی زبان اور اُسلوب کا جائزہ لیں کہ اپنی تاب اور توانائی میں ان کا اُسلوب کس قدر دل کش اور شگفتہ ہے۔ وہ رعنائی خیال اور حسنِ احساس کی تعبیر: رنگ اور خوشبو کی کس تخلیقی شان سے آشکار کرتے ہیں۔ بے رنگ اور بدمزہ زبان میں تحقیق کے نام پر کاٹھ کباڑ اکٹھا کرنے والے، اردو کے سب سے بڑے محقق کی زبان اور اُسلوب کا نظارہ کریں، تاکہ انھیں معلوم ہو کہ حقائق کی بازآفرینی اور اس کی معنوی ترسیل خوب صورت اور دل کش اُسلوب ہی میں ممکن ہوسکتی ہے:

(الف): "ولی کی ایک اور خصوصیت ان کا وہ مخصوص راگ اور وہ لے ہے، جس سے اردو شاعری پہلی بار بھرپور طریقے سے آشنا ہوئی اور یہ راگ اور لے خود اردو شاعری سے مخصوص ہوگئے۔ اس راگ کو مسلسل غزلوں میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شعروں کا مجموعی راگ ایک ہی احساس کے پھیلاؤ سے

ہم آہنگ ہو کر، سُروں کو بیدار کرتا ہے اور راگ کا نرم خرام دریا بہنے لگتا ہے۔ لمبی بحروں کی غزلوں میں یہ راگ پھیل گیا ہے اور اس میں ایک آہستہ روی پیدا ہو گئی ہے، لیکن چھوٹی بحروں کی غزلوں میں یہ راگ اپنی تیزی سے اثر کو گہرا کر دیتا ہے۔ ولی کی لے، اس کے ترنم اور لہجے سے اردو شاعری کا مخصوص ترنم اور لہجہ قائم ہوتا ہے۔ اردو شاعری کے قدرتی راگ کو دریافت کرنے میں بھی اولیت کا سہرا ولی ہی کے سر بندھتا ہے۔'' [۶۹]

(ب): ''جب زبان پھلتی اور ترقی کرتی ہے، تو وہ اپنے قد کو اپنے سے قریب تر اور تہذیبی سطح پر غالب زبان کے معیار اور پیمانوں سے ناپتی ہے اور جن چیزوں اور خصوصیات کی اپنے اندر کمی پاتی ہے، اسی زبان سے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ چوسر کے زمانے میں انگریزی زبان نے فرانسیسی زبان و ادب سے خود کو بنایا سنوارا اور اس زبان کے خیالات، تلمیحات، استعارات، اندازِ بیان، اصناف اور اسالیب سے اپنے دامن کو وسیع کیا، اسی طرح اس زمانے میں دکن کے تخلیقی ذہنوں نے جب یہ محسوس کیا کہ ہندوی ادبیات سے اب زبان کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا اور جو کچھ لیا جا سکتا تھا، لیا جا چکا ہے، تو انھوں نے فارسی زبان و ادب کے خیالات، تلمیحات، اسالیب، اصناف، لہجہ و آہنگ کی طرف توجہ دی۔ فارسی زبان ایک زندہ زبان تھی اور تہذیبی سطح پر اس دور میں اس کی وہی حیثیت تھی، جو کم و بیش چوسر کے دور میں فرانسیسی زبان کی تھی۔ اس رجحان نے اردو زبان و ادب کو ایک نیا رخ؛ نیا موڑ دیا۔'' [۷۰]

(ج): ''فطری شاعر کے لیے شاعری کرنا اور سانس لینا ایک سا عمل ہے، لیکن تخلیق کے کرشمے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں میں شاعرانہ فطرت اور تخلیقی قوت ایک مدت تک زور دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور اس کا سبب وہ مخصوص جذبہ ہوتا ہے، جس کے محور پر ان کی تخلیقی قوت گردش کر رہی ہے۔ سراج کے ہاں غلبۂ عشق بنیادی جذبہ تھا اور اسی کے تار و پود سے ان کی شاعری نے اپنے نقش و نگار بنائے تھے۔ جب تک شباب کا سورج نصف النہار پر رہا، یہ جذبہ بھی سراج پر غالب رہا [شاعری ترک کرتے وقت سراج کی عمر چوبیس سال تھی] اور وہ عشق میں جلتے ہوئے شوق کے شعلوں کی داستان سناتے رہے، لیکن جب یہ سرد پڑنا شروع ہوا، تو اسی کے ساتھ

ان کی شاعری کی دیوی نے، جو سولہ سنگار کیے ہر دم ان کے سامنے رہتی تھی، ہاتھ کی چوڑیاں توڑ دیں؛ بال نوچ ڈالے؛ سنگھار ختم کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھی ہو گئی۔ شاعری ترک کرنے کا جو حکم ان کے مرشد نے دیا تھا، دراصل وہ خود سراج کے دل کی آواز تھی۔ آخر اس حکم کو قبول کرنے والے تو خود سراج ہی تھے، پھر جو شعلہ تیزی سے لپکتا ہے [سراج کا ضخیم کلیات پانچ چھ سال کے عرصے میں لکھا گیا]، وہ اسی تیزی سے بجھ بھی جاتا ہے۔ ہمارے اپنے دور کے شعرا میں مجاز اس عمل کی مثال ہے، جو تیزی سے اٹھا اور ساری فضا پر چھا گیا اور جب پانچ سات سال کے عرصے میں بجھا، تو مرتے مر گیا، لیکن اپنی شاعری کے چراغ کو دوبارہ روشن نہ کر سکا۔'' [۱۷]

ان اقتباسات کے مطالعے سے جو بات خاص طور پر متشکل ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے اُسلوب کی رعنائی: حسنِ خیال کی رنگینی سے وہ رنگ سمیٹتی ہے، جو احساس کی سجل اور کومل نزاکتوں کے رنگ اور ادا سے مزین ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تحقیقی اور تنقیدی سرمایہ: تخلیقی اُسلوب کی دل کشی اور شگفتگی کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے اُسلوب کو فکری اور تہذیبی رنگ آمیزی سے تازہ اور شاداب رکھتے ہیں۔ ان کی زبان تہذیبی عناصر کے جمالیاتی رنگوں سے تشکیل پاتی ہے۔ ان کے ہاں طرزِ ادا: لطافتِ احساس اور رعنائی خیال کے امتزاج سے ایک ایسا دائرہ ترتیب دیتی ہے کہ جس کے سرے شاعرانہ آہنگ سے جا ملتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی زبان شاعرانہ نہیں ہوتی، وہ اس کی آرائش تو کرتے ہیں، جو اس کے حسن اور دل کشی میں اضافے کا باعث بنتی ہے، مگر اس آرائشِ بیان میں آورد کا گماں نہیں گزرتا۔ وہ جملے کی ساخت میں لفظوں کی ترتیب اور تہذیب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کا جملہ اپنے داخلی آہنگ اور اس کے احساس سے معطر رہتا ہے۔ ان کے جملے کی بناوٹ ان کے داخلی جذبوں کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اس میں رنگ و آہنگ اور دل کش لہجے کا تال میل ایک ایسی معنوی فضا پیدا کرتا ہے، جو ان کے اُسلوب کو جمالیاتی سرتال سے ہم کنار کرتی ہے:

''یوں جالبی کا شمار ہمارے اچھے نثر نگاروں میں ہوتا ہے، لیکن اس تاریخ ادب میں انھوں نے فکر و ریاض کے کچھ اور مرحلے طے کر کے ایک ایسا اُسلوب اختیار کیا ہے، جسے اردو کا بنیادی اُسلوب کہا جا سکتا ہے۔ اردو میں ایک سے ایک صاحبِ طرز ادیب موجود ہے، لیکن وہ طرز کم یاب ہے، جسے ہم غیر ضروری آرائشوں سے پاک کہہ سکیں۔ میری مراد اس اُسلوب سے ہے، جو نہ تو اتنا مرصع اور پر کشش ہو کہ پڑھنے والا اس کے حسن میں کھو جائے اور مطالب کی

حیثیت ثانوی رہ جائے اور نہ اتنا عالمانہ ہو کہ جو بات کہی جائے، وہ لغت کے راستے سے ذہن تک پہنچے اور ایسا اُسلوب بھی نہ ہو، جو علمی مباحث کا متحمل نہ ہو سکے۔ مولوی عبدالحق اور پھر ڈاکٹر عابد حسین نے سیدھے، لیکن باوقار طریقے سے جو ڈھنگ نکالا تھا، میرے نزدیک علمی تحریروں کے لیے اس سے بہتر اُسلوب نہیں ہو سکتا۔ جمیل جالبی نے اسی طرزِ سخن کو آگے بڑھایا ہے۔" [۷۲]

تحقیق اور تدوین کے رنگ

تحقیق: حقائق کی تلاش وجستجو اور ان کی باز آفرینی ہی کا نام نہیں، یہ تہذیبی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں ممد و معاون بھی ہے اور اس کی حیاتِ دوام کی ضامن بھی۔ معاشرتی زندگی میں مثبت اقدار کی جلوہ آرائی: علمی وادبی تحقیق سے وابستہ ہوتی ہے، کیوں کہ زندگی کے سارے رنگ رس تحقیقی اُسلوب سے نکھرتے اور سنورتے ہیں۔ تحقیق کسی بھی تہذیب اور معاشرے کے علمی اور ادبی رویوں کی گہرائی اور تہ داری کا اظہاریہ ہوتی ہے۔ معاشرتی زندگی کا فکری نظام اپنی معنوی رعنائی اور گہرے جمالیاتی شعور کے لیے تحقیق کا مرہونِ منت ہوتا ہے، کیوں کہ:

> ''جب کسی معاشرے میں تحقیق کا عمل ناکارہ سمجھا جانے لگتا ہے، تو وہاں اپنے سارے جھوٹ: سچائیاں بن کر، خود معاشرے کو گھن کی طرح کھانے لگتے ہیں کہ بے تحقیق معاشرہ ہر سطح پر ناکارہ و بے جان ہو جاتا ہے اور تھکا دینے والا غبار اسے اور اندھا کر دیتا ہے۔'' [۷۴]

معاشرتی زندگی میں تحقیق کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ فرد کی انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک فکر و فرہنگ کے تمام تر رویے: تحقیقی آہنگ کی خوشبو سے معطر رہتے ہیں۔ حقائق کی بازیافت زندگی کی مثبت قدروں کو طرزِ احساس کی وہ جمالیاتی بوقلمونی عطا کرتی ہے، جس سے زندگی کا معنوی نظام کچھ نئے منظرناموں کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ تحقیق: معاشرتی رویوں میں تازگی اور شادابی کی امین ہوتی ہے، کیوں کہ جس معاشرے میں تحقیق کا عمل جمود کا شکار ہو جائے، وہاں انسانی زندگی میں آگے بڑھنے کی امنگ ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ زندگی کا نظام: تصورِ حقیقت کی اس مسلسل اور متواتر صورت کا ترجمان ہوتا ہے، جو مذہبی صداقتِ احساس کی صورت میں اس کے پس منظر میں موجود ہوتی ہے۔ جس طرح تحقیقی رویوں کا عمل دخل معاشرتی زندگی کے جملہ شعبوں میں موجود ہوتا ہے، اسی طرح ادب میں بھی اس کی حیثیت بنیادی اور اساسی ہوتی ہے، کیوں کہ:

> ''تخلیق، تنقید اور علم و ادب کی ہر شاخ کو پورے طور پر پروان چڑھانے کے لیے

> تحقیق کا عمل ضروری ہے۔ وہ ادیب، نقاد اور شاعر، جو تحقیق سے دامن بچاتے
> ہیں، اسے بے ضرورت اور غیر اہم سمجھتے ہیں، یا بے خبری میں اپنی تخلیق و تحریر سے
> سرسری گزر جانا چاہتے ہیں، علم و ادب کی دنیا میں ہرگز وہ کام نہیں کر سکتے، جس
> کی وہ آرزو رکھتے ہیں۔ اقبال نے خوب صورت شاعری کی، لیکن ان کی عظیم
> تخلیقی قوت نے ان کے تحقیقی مزاج کی مدد سے زندگی کے پھیلاؤ اور مسائلِ
> حیات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر عملِ ارتقا طے کیا اور وہ، وہ بن گئی کہ جو وہ
> ہے۔ ہر بڑا شاعر، ہر بڑا ناول نگار اور افسانہ نویس، ہر بڑا نقاد، ہر بڑا فلسفی، ہر
> بڑا سائنس دان تحقیق کے بغیر کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتا۔ بڑی تخلیق کے
> لیے تحقیق اتنی ہی ضروری ہے، جتنا پانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔" [۴۷]

تحقیق کے ساتھ عدمِ اشتراک کے باعث ہمارا ادبی اور فکری نظام اپنے تہذیبی مدار سے ہٹ کر رہ
گیا۔ اہلِ شعر و ادب میں فکر و فرہنگ کی وہ تازگی نہیں رہی، جو تحقیقی اشتراک سے پھوٹتی تھی۔ دوسری طرف
تحقیق، تخلیق اور تنقید سے غیر متعلق ہو کر اعداد و شمار کا گوشوارہ بن کر رہ گئی۔ اس میں نہ تو ادبی چاشنی کے
رنگ کہیں جلوہ آرا ہیں اور نہ ہی رنگینیِ اظہار سے بھرپور اُسلوب......... کیوں کہ اس میں صحت مند
رجحان صرف اسی صورت میں نمو پذیر ہو سکتا ہے، جب تحقیق، تنقید اور تخلیق کے مابین نہایت گہرا رشتہ
استوار ہو جائے۔ بہ صورتِ دیگر ایک دوسرے سے کٹ کر یہ سطحی اور اکہری معنویت کی حامل ہو جاتی
ہیں، ان میں معنوی تہ داری اور گہرائی کا حسن باقی نہیں رہتا۔ البتہ جب ان کے مابین اثر و نفوذ کا سلسلہ
پیدا ہو جائے، تو ربط و انجذاب کے اثر سے تاثراتی آہنگ کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور ان میں فکری گہرائی
اور رعنائیِ احساس کے رنگ عکس انداز ہونے لگتے ہیں۔

[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک ایسے محقق ہیں، کہ جن کے ہاں تحقیق اور تنقید ہم رنگ ہو کر تخلیقی آہنگ میں ڈھل
گئیں۔ انھوں نے اشتراک اور امتزاج کے حسن سے خیال کی رعنائی کو ایک ایسا اُسلوب عطا کیا، جو
تازگی اور شگفتگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کا تحقیقی آہنگ ان کے تنقیدی اُسلوب سے پھوٹتا ہے، کیوں کہ
تنقیدی شعور ہی وہ طرزِ احساس ہے کہ جس سے تحقیق کا رنگ نکھرتا ہے اور اس سے ایک نئے جہانِ معنی
کی تشکیل ہوتی ہے۔ تنقید میں تحقیق کے سارے رنگ اس اُسلوب کی کارفرمائی کی دلیل ہیں، جو اسے
تاثراتی آہنگ سے بچاتے ہیں، کیوں کہ تنقید اگر تاثرات کی گرداب میں الجھ جائے، تو اپنی معنوی جلوہ
آرائی کو کم کر دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح تحقیق، تنقیدی شعور کے عمل دخل سے جدا ہو کر حرف شماری کا

علامیہ بن جاتی ہے۔ اس میں نہ تو منطقی ترتیب پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی نتائجِ فکری کے استخراج کا عمل اپنی صحیح صورت میں متشکل ہو سکتا ہے۔ تنقید کی طرح تحقیق بھی اپنی جمالیاتی بنیادیں رکھتی ہے، لیکن ان دونوں کے مابین اگر حدِ فاصل قائم کر کے انھیں دو مختلف اور کسی قدر متضاد دوائر میں مقید کر دیا جائے، تو ان کا معنوی نظام اپنی حقیقی قدروں کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتا اور اس طرح تنقید اور تحقیق اپنے اپنے دائروں میں گردش کناں تو رہتی ہیں، مگر اپنے اپنے فکری نظام کی رنگارنگی کا ادراک نہیں کر سکتیں اور یوں اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہتی ہیں۔ ڈاکٹر جالبی رقم طراز ہیں کہ:

> ''تنقیدی شعور وہ عمل ہے، جس سے تحقیق کا جوہر نکھرتا ہے اور تحقیقی شعور وہ جوہر ہے، جس سے تنقیدی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ان سب کاموں کو دیکھ کر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ تنقید اور تحقیق دونوں ایک دوسرے سے روٹھی ہوئی ہیں اور ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی ہیں۔ جن محققین نے تنقیدی شعور کو استعمال کیا ہے، ان کے ہاں تحقیقی مزاج اور تحریر میں آپ کو ایک روشنی نظر آئے گی۔ یہاں میں حافظ محمود شیرانی اور شیخ چاند کی مثالیں دوں گا۔ ان کے ہاں تحقیق اور تنقید ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ تحقیق میں ہمارے ہاں اکثر ایک ڈھیلے پن کا احساس ہوتا ہے، جسے جدید محققین کو زیادہ مربوط اور زیادہ منطقی بنانے کی ضرورت ہے۔'' [۵/۷]

خود ڈاکٹر جالبی کے ہاں تنقید: تحقیق کے حسنِ آہنگ سے رنگ کشید کرتی ہے اور تنقید کا اُسلوب: تحقیق کے حسنِ خیال سے معنی کی رعنائی کا ایک ایسا خزینہ دریافت کرتا ہے، جو ہر دو کو ایک دائرے میں لا کر ایک ایسا امتزاجی آہنگ مرتب کرتا ہے، جو تحقیق اور تنقید دونوں کی وسعتِ آشنائی کی دلیل بھی ہے اور ان کی تازگی اور شادابی کا آئینہ دار بھی، کیوں کہ اس طرح ان دونوں کے امتزاج اور اشتراک سے ایک ایسی منطقی صورت نمود پذیر ہوتی ہے، جو ادب کے خارجی اور داخلی رویوں کی غماز ہے۔ اس امتزاجی آہنگ سے اس معنوی اکائی کی تلاش اور شناخت آسان ہو جاتی ہے، جسے جزئیات میں بانٹ کر دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں اس امتزاجی رویے سے سماجی اور تہذیبی حوالوں کی بازیافت کا عمل جب ادبی تناظر میں سامنے آیا، تو تحقیقی آہنگ میں ایک نئی صورت جلوہ گر ہوئی۔ ان کے بہ قول:

> ''تحقیق اور تنقید ہمارے ہاں الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ اہلِ تحقیق: تنقید کو...... اور نقاد: تحقیق کو ضروری اہمیت نہیں دیتے، اسی لیے تحقیق: تنقید کی فکری گہرائی سے اور تنقید: تحقیقی صحت سے عاری ہے۔ میں نے تحقیق کو تنقید

میں جذب کر کے اسے ایک نئی صورت دینے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے 'تحقید' کا لفظ استعمال کیا ہے۔" [۷۶]

ڈاکٹر صاحب کے ہاں 'تحقید' نئی صورت نے فکری اور معنوی تعبیرات کو تحقیق کے محدود دائرۂ کار میں رکھ کر دیکھنے اور اس کے معنوی نظام کا استخراج کرنے کے بجائے اسے تنقیدی اُسلوب کی معاونت سے وسعت آشنا کرنے پر زور دیا۔ وہ خود جس موضوع پر بھی لکھتے ہیں، اس سے متعلق سارے مواد اور مآخذ کا گہرا مطالعہ اور تجزیہ کرتے ہیں اور پھر کہیں جا کر اس سے اپنے معنوی آہنگ اور فکری نتائج کا استخراج کرتے ہیں۔ وہ مواد کی فراہمی کے ضمن میں قلمی کتابوں سے بھی اخذ و استفادہ کرتے ہیں اور مطبوعات سے بھی۔ وہ استفادہ تو بنیادی مآخذ سے کرتے ہیں، لیکن ثانوی اور ضمنی مصادر بھی ان کی نگاہ سے مستور نہیں رہتے۔ وہ غیر ادبی مواد سے بھی اکتسابِ فیض کرتے ہیں اور بعض اوقات ادبی مواد کے تجزیاتی مطالعات کے دوران میں، وہ غیر ادبی اور دوسرے علوم و فنون کے لوازمے سے بھی نئے معانی اخذ کرتے ہیں۔ اس عمل سے حیرت انگیز رویوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ ادبی مصادر کے ساتھ ساتھ غیر ادبی مصادر کے استعمال سے تحقیق عدم توازن کا شکار نہیں ہوتی۔ تحقیقی عمل میں صرف ادبی لوازمے تک اپنے آپ کو محدود کرنے سے بعض اوقات وہ نتائج حاصل نہیں ہو پاتے، جو غیر ادبی مصادر سے اخذ و استفادے کی صورت میں فراہم ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کے بہ قول:

"تحقیق میں میرا مسلک، اگر اسے مسلک کہا جا سکتا ہے، تو یہ ہے کہ میں کسی امر کی تحقیق میں ادبی مآخذ تک خود کو محدود نہیں رکھتا، بل کہ غیر ادبی مآخذ پر بھی پوری توجہ دیتا ہوں، تا کہ حقیقت کا سرا ہاتھ آ سکے۔ میں یہاں ایک مثال دیتا ہوں۔ تذکرۂ ہندی میں مصحفی نے لکھا ہے کہ: جب عہدِ محمد شاہ میں ولی دکنی کا دیوان دہلی پہنچا، تو اس کی غزلیں چھوٹے بڑوں کی زبان پر جاری ہو گئیں اور لوگ ولی کے ریختے گلی کوچوں میں پڑھنے لگے۔ کام کرتے ہوئے تجسس پیدا ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ دیوانِ ولی شمالی ہند پہنچا اور وہ آگ کی طرح گلی کوچوں میں پھیل جائے۔ اس کا جواب کسی تذکرے یا کسی اور دیوان یا کسی ادبی حوالے سے نہیں ملا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مرزا محمد حسین قتیل کی تصنیف ہفت تماشا پڑھ رہا تھا، اس میں ایک جگہ لکھا تھا کہ: کائستھ ہولی کے زمانے میں، نشے کی حالت میں گلستان، بوستان اور ولی کے ریختے پڑھتے ہوئے گلی کوچوں سے گزرتے تھے۔ تذکروں میں صرف مصحفی نے شاہ حاتم کے حوالے سے یہ بات لکھی تھی، جس کی تصدیق ایک غیر ادبی مآخذ سے ہوئی۔ یہ طریقۂ کار تحقیق کے لیے مفید بھی ہے اور مناسب بھی"۔ [۷۷]

تدوین نگاری کا فن کبھی ہمارے ہاں زیادہ اہمیت کا حامل نہیں رہا۔ اصل میں یہ کام اتنا مشکل اور ادق ہے کہ ہر کہہ ومہہ اس میدان میں نہ تو سرگرمِ کار ہو سکتا ہے اور نہ ہی کامگار.......... جو لوگ اس طرف آئے بھی، ان میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے، جو تدوینی کام کے ساتھ ذوقی اور فکری مناسبت نہ رکھتے تھے، یوں یہ کام اردو ادب میں کسی خوش کن منظرنامے کا جمالیاتی آہنگ مرتب نہ کر سکا۔ لے دے کر چند ایک مدون ہیں، جنھوں نے قدیم اور کلاسیکی متون کو اس فن کے مجموعی فکری اور فنی تناظر میں مرتب کرنے کی سعی کی۔ ان تدوین کاروں میں ڈاکٹر جالبی کا نام نہایت اہم ہے۔ اب تک انھوں نے تین متون کو مرتب کیا۔ یہ متون اردو ادب کے دکنی عہد سے متعلق ہیں:

(۱) دیوانِ حسن شوقی [۱۹۷۱ء]

(۲) دیوانِ نصرتی [۱۹۷۲ء]

(۳) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ [۱۹۷۳ء]

دیوانِ حسن شوقی ان کی تدوین اور ترتیب کا عمدہ نمونہ ہے۔ شوقی کا کلام کسی مخطوطے یا بیاض میں یک جا صورت میں کبھی بھی نظر نواز نہیں رہا۔ اس کی غزلیں اور اشعار ادھر ادھر بکھری صورتوں میں تو مل جاتے ہیں، مگر شاید ہی انھیں کبھی یک جائی نصیب رہی ہو۔ غزلوں کے ریزہ ریزہ اشعار کو اکائی کی صورت میں مرتب کر کے، ان کا تجزیاتی مطالعہ کرنا یقیناً ایک اہم کام تھا، لیکن ڈاکٹر جالبی سے قبل کسی محقق یا مدون کی توجہ شوقی اور اس کے کلام کی تدوین کی طرف مبذول نہ ہوئی۔ حالاں کہ حسن شوقی اپنے عہد کا نمایندہ غزل گو تھا۔ اس کے طرزِ فکر کی رعنائی اور طرزِ احساس کی رنگینی نے نہ صرف اس کے معاصرین کو متاثر کیا، بل کہ بعد میں آنے والے شاعر بھی اس کے کلام کی فکری اور معنوی جمالیات سے کسبِ فیض کرتے رہے۔ ولی دکنی جیسا غزل گو اس کے فکر وفن کے کومل اور سجل رویوں کا اسیر رہا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس اہم، مگر فراموش کردہ شاعر کے کلام کو کھوج نکالا اور اس کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے مستند اور بنیادی مآخذ سے اس کے حالات اور کلام کی تہذیب کی۔ خاص طور پر شاعر کے کلام اور اس کی زبان و بیان کا مطالعہ اس عہد کے تہذیبی، سیاسی، سماجی اور تاریخی احوال کی روشنی میں قلم بند کیا۔ حسن شوقی نظام شاہی دربار سے وابستہ رہا۔ جب یہ سلطنت زوال پذیر ہوئی، تو وہ عادل شاہی دربار سے متعلق ہو گیا۔ اپنے معاصر شعری اور ادبی منظرنامے پر اس کے فکری اور فنی رویے اثر انداز ہوتے رہے۔ ولی دکنی کے زمانے تک اس کے کلام کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ وہ قدیم اردو کے اہم تر شاعروں میں

سے ایک تھا۔ اس نے اردو میں مقامی بولیوں کے اثرات پر، جس طرح فارسی کے رنگ و آہنگ کا روغن چڑھایا، وہ بہ طورِ خاص، بہت اہم ہے۔ اس کے کلام میں زبان و بیان کی چاشنی اور گھلاوٹ بھی ہے اور اُسلوب کی ندرت اور تازہ کاری بھی۔ اس کے کلام میں جو زورِ بیان اور اثر انگیزی پائی جاتی ہے، وہ اس کے معاصرین کے ہاں ذرا کم ہی دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے شوقی کی غزلوں کے ساتھ اس کی مثنویوں کا بھی تجزیاتی مطالعہ کیا۔ انھوں نے تاریخی حالات کی روشنی میں بھی ان کا جائزہ لیا۔ شوقی نے ان مثنویوں میں، جن واقعات کو نظم کیا، وہ تاریخ اور تذکروں میں بھی محفوظ ہیں۔ اس نے اپنے شاعرانہ اسلوب میں تاریخی احوال کو مسخ نہیں کیا اور نہ ہی واقعیت پر افسانوی ملمع کاری کی۔ ان مثنویوں کے لسانی آہنگ پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی رقم طراز ہیں کہ:

> ”جب ہم میزبانی نامہ کا مقابلہ فتح نامہ سے کرتے ہیں، تو فتح نامہ پر ہندوی اسلوب کا اثر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے اور میزبانی نامہ میں فارسی اُسلوب و آہنگ کا........ اس میں شاعری بھی زیادہ ہے اور تخیل کی پرواز بھی۔ پوری مثنوی میں ایک چلت پھرت؛ ایک ہنگامہ؛ ایک دھوم دھام کا احساس ہوتا ہے۔“[۷۸]

ڈاکٹر صاحب تحقیق و تدقیق اور تدوین و ترتیب کے دشوار گزار مراحل سے گزر کر شوقی کے کلام کی تدوین اور تہذیب میں کامگار ہوئے۔ تدوین کا کام ویسے بھی جگر کاوی کا تقاضا کرتا ہے، چہ جائے کہ شاعر کا کلام کسی مخطوطے یا بیاض کی صورت میں یک جا ہی نہ ہو۔ انجمن کے کتب خانہ خاص کے تقریباً سبھی مخطوطات ان کے زیرِ مطالعہ رہے تھے۔ تاریخ ادبِ اردو کی تحریر و تسوید کے لیے مواد اور لوازمے کی فراہمی کے سلسلے میں انھوں نے بابائے اردو کے کتب خانے کے نادر اور بعض صورتوں میں منحصر بہ فرد نسخوں کا دقتِ نظری سے مطالعہ کیا۔ یوں ان مخطوطات اور قلمی رسائل سے انھوں نے حسن شوقی کے کلام کے پھول چنے اور پھر انھیں ایک گل دستے کی صورت میں پرو دیا۔ بادی النظر میں شاید یہ کام کچھ زیادہ اہمیت اور افادیت کا حامل نہ ہو، مگر تحقیق کی دنیا میں اس تدوینی کام کی بے پناہ اہمیت ہے اور وہ بھی ایک ایسے شاعر کا کلام، جو نہ صرف اپنے عہد کا نمایندہ غزل گو ہو، بل کہ اس کے کلام کا کوئی مخطوطہ بھی موجود [اور محفوظ] نہ ہو۔ اس کے کلام کو مختلف قلمی رسالوں اور مخطوطوں سے ڈھونڈ نکالنا اور پھر اسے تدوینی منہج اور اس کے تقاضوں کے مطابق ترتیب دینا یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شوقی کی

غزلیات کی تدوین اور تہذیب کے دوران میں اس شاعر کے کلام کی شعریات کو بھی مرتب کیا۔ انھوں نے شوقی اور اس کے عہد کے لسانی مباحث پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ دسویں صدی ہجری کے اس شاعر کے کلام کی تفہیم کچھ اتنا آسان کام نہ تھا۔ دکنی اور مقامی زبانوں کے متنوع اثرات اس کے کلام کو دبیز پردوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ ان پردوں میں پڑے کلام کے قدیم معنوی آہنگ تک رسائی یقیناً مشکل تھی اور:

''خصوصاً اس حالت میں کہ لغات نویس حضرات نے اپنی تصانیف کے دامن پر ان قدیم الفاظ کی چھینٹ تک نہ آنے دی ہو، یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔''[۷۹]

مگر ڈاکٹر صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف **دیوانِ حسن شوقی** کے مشکل، نامانوس اور ادق الفاظ کی فرہنگ ترتیب دی، بل کہ اس کے کلام کے شعری محاسن اور لسانی خصائص کا تفصیلی تجزیہ بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس تجزیاتی مطالعے سے نہ صرف شوقی، بل کہ اس کے عہد کے لسانی رویوں کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور یوں یہ کام محض تدوین کے میکانکی اور تکنیکی عمل تک محدود نہیں رہا، بل کہ ان کے تنقیدی شعور کی بدولت اس میں رعنائیِ احساس اور حسنِ خیال کے کتنے ہی چراغ لو دے اٹھے۔ ان کا تنقیدی آہنگ: تحقیقی نکات اور نتائج کی تخریج میں ان کا معاون اور مددگار رہا۔

ڈاکٹر جالبی لفظوں کے بطون میں جھانکنے اور ان کے اندر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کو جانچنے اور پرکھنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ لفظ سے معنی کا سفر، پیشِ نظر فن پارے کے فکری اور فنی آہنگ سے مرتب کرتے ہیں۔ ان کے نتائجِ تحقیق: فکری اور جمالیاتی سطح پر، ایک ایسے لسانی اور ادبی رجحان کی نمایندگی کرتے ہیں، جو قدیم ادب کی بازیافت کے عمل کو اس کے عہد کی جملہ شعریات اور اس کی لطافتوں کے تناظر میں، تاریخ ادب کی ٹوٹی پھوٹی کڑیوں کو جوڑنے اور ان سے معنوی فضا کشید کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حسن شوقی کی زبان اس زمانے کے دکن کی عام بول چال کی زبان ہے۔ اس میں ان تمام بولیوں اور زبانوں کے اثرات کی ایک کھچڑی سی پکتی دکھائی دیتی ہے، جو آیندہ زمانے میں ایک جان ہو کر، اردو کی معیاری شکل متعین کرتے ہیں۔''[۸۰]

ڈاکٹر جالبی نے **دیوانِ حسن شوقی** کی تدوین و تصحیح کے ساتھ شاعر کی زبان اور دوسری زبانوں

کے ساتھ قدیم اردو کے تعلقات کا نہایت عمدہ مطالعہ پیش کیا۔ انھوں نے دسویں صدی ہجری کی زبان اور اس کی شعریات کا تجزیہ کر کے اردو کے لسانی سرمائے کو ماضی اور مستقبل کی قدروں کے ساتھ رکھ کر دیکھنے اور ان کی معنویت کا ادراک کرنے کی سعی کی۔ انھوں نے لفظ اور اس کے استعمالات کا بھی تجزیہ کیا اور لفظوں کی معنوی فضا بندی سے بھی غافل نہیں رہے۔ ہماری لغات دکنی عہد کی لفظیات اور ان کی معنوی جمالیات کی صورت پذیری سے اغماض برتتی رہیں، ڈاکٹر جالبی نے اس عہد کی زبان کو فکری، فنی اور جمالیاتی زاویہ ہائے نظر سے جانچنے اور اس کی معنوی فضا کی تشکیل اور اس کے تعین میں اپنی خوش ذوقی اور زبان فہمی کا ثبوت دیا۔ اس حوالے سے بھی دیوانِ حسن شوقی اپنی طرز کا نمایندہ تدوینی کارنامہ ہے۔

حسن شوقی کی آواز ایک زندہ تہذیب کی نقیب اور ترجمان ہے۔ اس کے کلام میں تہذیب کی عکاسی: زبان کے بدلتے ہوئے تیوروں سے ہوتی ہے، کیوں کہ اردو زبان کے بدلتے تیوروں میں اس تہذیب کا باطن جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ شوقی کی زبان اس عہد کے فکری، جمالیاتی اور ذہنی رجحانات کی سرگزشت بھی ہے اور مجملہ رویوں کی آئینہ دار بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان رجحانات کے تناظر میں زبان کے بدلتے ہوئے منظرنامے کی تعبیر کو اس عہد کے تہذیبی آثار میں دیکھنے، اور پھر اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کا جتن کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ ہے قدیم اردو غزل کی روایت کا وہ دھارا، جس کے درمیان حسن شوقی کھڑا ہے۔ وہ اپنے اسلاف سے اس روایت کا اثر قبول کرتا ہے اور اسے ایک نیا اُسلوب دے کر آنے والے شعرا تک پہنچا دیتا ہے۔ یہی وہ اثر ہے، جو حسن شوقی کو قدیم ادب میں ایک خاص اہمیت کا مالک بنا دیتا ہے۔ شوقی کی غزل میں مشتاق، لطفی، محمود، فیروز، خیالی کے اثرات ایک نئے روپ میں ڈھلتے ہیں اور پھر یہ نیا روپ: شاہی، نصرتی، ہاشمی، اشرف، سالک، یوسف، تائب، قریشی اور ایسے بہت سے دوسرے نامعلوم و گم نام شعرا کے ہاں سے ہوتا، ولی کی غزل میں رنگ جماتا ہے۔ ولی اپنے سے پہلے آنے والے شعرا کی، صدیوں کی اس کوشش و کاوش اور امکانات کو سمیٹ کر، انھیں شمالی ہند کی زبان سے ملا دیتا ہے اور اس طرح اردو غزل کو ایک نئے امکان سے؛ ایک نئے رنگ روپ سے آشنا کرتا ہے اور جب اس کی شاعری کا سورج نصف النہار پر آتا ہے، تو اس کے سامنے سب شاعروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے، جنھوں نے صدیوں تک ادبی فضاؤں کو منور کیا تھا اور جب ولی

کے ہاں یہ روایت اپنی شکل وصورت بنالیتی ہے، تو وہ نصرتی کی طرح اپنی شاعری کا مقابلہ اپنے سے پہلے کے اس شاعر سے کرتا ہے، جس نے روایت کو بنا سنوار کر نئے امکانات سے روشناس کیا ہے، تو وہ کہہ اٹھتا ہے:

برجا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دُجے بار
رکھ شوق میرے شعر کا شوقی حسن آوے

روایت یونہی بنتی اور بدلتی ہے اور جب سیکڑوں شاعر برسوں تک اپنے خونِ جگر سے روایت کے درخت کی آبیاری کرتے ہیں، تب کہیں 'تخلیق' کا ایک سدا بہار پھول کھلتا ہے، جسے کوئی ولی کہتا ہے، کوئی حافظ، سعدی، میر، غالب، اقبال کا نام دیتا ہے، کوئی دانتے اور چوسر کے نام سے یاد کرتا ہے اور ہم: حسن شوقی جیسے شاعروں کو بھول جاتے ہیں۔" [۸۱]

ڈاکٹر وحید قریشی دیوانِ حسن شوقی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"کتاب کا دیباچہ اس نئی دریافت کی لسانی اور ادبی حیثیت کو متعین ہی نہیں کرتا، بل کہ تاریخِ ادب میں دکنی روایت کی کڑیاں بھی اردو شاعری کے بعد کے ادوار سے ملاتا ہے۔ نصرتی سے لے کر ولی تک، شاعری کی جو روایت پروان چڑھی ہے، اس کے بارے میں نقادوں میں خاصی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ولی کو عموماً اس حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ایک صبح بیدار ہوئے اور انھوں نے طے کیا کہ آئندہ سے فارسی اثرات کو قبول کرتے ہوئے شعر کہا کریں گے۔ جالبی صاحب ولی کو دکنی روایت سے الگ کر کے دیکھنے کے قائل نہیں۔ انھوں نے نصرتی سے لے کر ولی تک کی دکنی شاعری میں جس طرح فارسی روایت کے انجذاب کا عمل ہوتا رہا ہے، اس کا سراغ لگا کر ادبی روایت کے تسلسل کی نشان دہی کی ہے۔ اسی اعتبار سے وہ حسن شوقی کے کلام کو ایسا 'درمیانی پل' قرار دیتے ہیں، جس کے بغیر روایت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ روایت کے اس تسلسل سے جالبی صاحب نے بعض دوسرے اہم نتیجے بھی نکالے ہیں۔" [۸۲]

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر جالبی کے لسانی تجزیے کے حوالے سے بھی نہایت اہم اور خوب صورت گفتگو کی۔ انھوں نے فرہنگ کے بعض مقامات پر معنی کے تعین میں ڈاکٹر جالبی سے اختلاف بھی کیا، جو نہ صرف درست ہے، بل کہ شوقی کی زبان کی اس جہت کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کراتا ہے، جو لفظ اور ان کے معنوی پیکروں کے پنجابی کے ساتھ فطری مناسبت کے ترجمان بھی ہیں۔

دیوانِ نصرتی اوّل اوّل سہ ماہی صحیفہ لاہور [شمارہ ۶۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء] کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوا۔ بعدہ ۱۹۷۲ء میں قوسین، لاہور نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ نصرتی گیارھویں صدی ہجری کا نمایندہ شاعر ہے۔ دیوانِ نصرتی کی تدوین اور اشاعت سے قبل اس کی تمام تر شہرت اس کی مثنویات کی وجہ سے تھی۔ وہ صدیوں تک اسی صنفِ سخن کے حوالے سے زندہ رہا، مگر ڈاکٹر جالبی نے دیگر اصنافِ سخن میں بھی اس کا کلام تلاش کر کے، اس کا فکری اور فنی تجزیہ کیا۔ وہ غزل کی صنفِ سخن کا بھی نمایندہ شاعر رہا اور قصیدے کی صنف بھی اس کے معنوی اور فنی کمالات کی گواہ رہی۔ اس نے غزل میں بھی اپنی تخلیقی توانائی اور جمالیاتی رعنائی کا احساس دلایا اور قصیدے میں بھی۔ اس کی غزلیں دکنی تہذیب کی روایت کے طرزِ احساس اور رعنائی خیال کی آئینہ دار ہیں۔ اس کی غزلوں کی موضوعاتی اپیل اگرچہ 'سخن از زناں گفتن اور سخن با زناں گفتن' تک محدود ہے، مگر اس نے اس موضوع کو سو سو رنگوں سے باندھا اور اپنے فن کے اتنے مناظر دکھائے کہ اسے پڑھتے ہوئے، اس کے تخیل اور قدرتِ کلام کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔

غزل کی طرح قصیدہ بھی اس کی معنی آفرینی اور نکتہ وری کے اظہار سے محروم نہیں رہا۔ خود مرتب نے اسے ذوق اور سودا کے مماثل ٹھہرایا۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی اس کے فکری اور فنی اظہار کی جولان گاہ ہے، جس میں اس نے دادِ سخن دی اور کامیاب رہا۔ ڈاکٹر جالبی رقم طراز ہیں کہ:

> "وہ ایک باشعور فن کار ہے، جسے یہ معلوم ہے کہ وہ کیا تخلیق کر رہا ہے اور اس کی ہیئت و نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ جب فن اور شاعرانہ اعتبار سے وہ اتنا عظیم شاعر ہے، تو آخر اب تک اردو ادب کی تاریخ میں نصرتی کو وہ مقام کیوں حاصل نہ ہو سکا، جو اس کے بعد کے شعرا میں ولی دکنی کو میسر آیا؟ اس کی وجہ نصرتی کی شاعری نہیں، بل کہ اظہار و بیان کی وہ روایت ہے، جس میں نصرتی نے اپنے کمالِ شاعری کو پیش کیا اور جو مغلوں کی فتحِ دکن کے بعد ادب کے معیاری اُسلوب کی حیثیت سے متروک ہو گئی۔ نصرتی کی زبان معیاری دکنی تھی، جس کے اظہارِ بیان کا ایک نیا معیار 'شعرِ تازہ' کے نام سے خود نصرتی نے قائم کیا تھا: دکن کا کیا شعر جیوں فارسی .... اگر دکن کی یہ سلطنتیں باقی رہتیں اور دکنی ادب کا یہ روپ قائم رہتا، تو آج بھی نصرتی قدیم اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار پاتا، لیکن ہوا یہ کہ مغلوں کی فتح کے بعد شمالی ہند کی

زبان دکنی ادب کی زبان پر غالب آ گئی اور تیزی سے سارے برِ عظیم میں ادبی اظہار کا واحد معیار بن گئی۔ یہ تہذیبی ولسانی تبدیلیوں کی ستم ظریفی ہے، جو تاریخ کے موڑ پر اکثر اس طرح اچانک آتی ہیں کہ بڑے درخت گر جاتے ہیں اور پھر یہ ہوتا ہے کہ چھوٹے درخت بڑے نظر آنے لگتے ہیں۔ تاریخ کی اس ستم ظریفی نے نصرتی کو چھوٹا اور ولی کو بڑا بنا دیا۔........ انھیں تہذیبی و لسانی تبدیلیوں نے نصرتی جیسے عظیم شاعر کو جو بہ حیثیتِ شاعر ولی سے کہیں بلند ہے، ٹکسال باہر کر کے تاریخ کی جھولی میں پھینک دیا۔........ تہذیب کے سانچے بدلنے کے ساتھ جب اُسلوب بدلتے ہیں، تو عظمتیں کس طرح مٹ کر اپنی معنویت کھو دیتی ہیں، ملا نصرتی تاریخ کی اس سفاکی کی مثال ہے۔'' [۸۳]

[۵]

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اردو کی قدیم ترین معلوم [اور محفوظ] مثنوی ہے۔ اسے ڈاکٹر جالبی نے ۱۹۷۳ء میں مرتب کیا۔ سندھ یونی ورسٹی نے اس کام کی ترتیب و تہذیب اور اس کے تجزیاتی مطالعات پر انھیں ڈی۔ لٹ کی سندِ فضیلت عطا کی۔ مشفق خواجہ اس مثنوی کی بازیافت اور بابائے اردو تک رسیدگی کے ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

'' حیدر آباد دکن میں ایک علم دوست بزرگ تھے لطیف الدین ادریسی، کتابوں کی تجارت ان کا مشغلہ تھا۔ وہ تلاش اور محنت سے کتابیں، خصوصاً قلمی کتابیں حاصل کرتے تھے اور انھیں اہلِ علم تک پہنچاتے تھے۔ ایک مرتبہ انھیں ایک دکنی مثنوی کا مخطوطہ کہیں سے ملا۔ انھیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس کی اور کس زمانے کی تصنیف ہے؟ ادریسی صاحب نے یہ مخطوطہ مشہور محقق مولانا نصیر الدین ہاشمی کو دکھایا۔ ہاشمی صاحب نے اسے سرسری طور پر دیکھا اور اس کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون **بھمنی عہدِ حکومت کا ایک دکنی شاعر** کے عنوان سے لکھ کر **معارف** اعظم گڑھ کے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے شمارے میں چھپوا دیا۔ ہاشمی صاحب نے اس مثنوی کے مرکزی کرداروں کدم راؤ پدم راؤ کی مناسبت سے اس کا نام کدم راؤ پدم راؤ رکھا۔ گو مصنف نے یہ نام نہیں لکھا تھا، لیکن مثنوی کی شہرت اسی نام سے ہوئی۔ مولانا نصیر الدین ہاشمی کے توسط، سے آج سے بیالیس سال قبل، اردو دنیا اس مثنوی کے وجود سے

آشنا ہوئی تھی، لیکن اس کی اصل اہمیت اس وقت واضح ہوگئی، جب یہ مخطوطہ
بابائے اردو کے پاس پہنچا۔'' [۸۴]

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا یہ مختصر یہ فرد مخطوطہ لسانی اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ قدیم اردو کی شعری روایت میں اس کی بازیافت ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ یہ ہیرا اب ایک سچے پارکھ اور جوہری کی تحویل میں تھا۔ وہ اس نگینے کو روایت کی انگوٹھی میں جڑنے اور اس کی قدر و قیمت کے تعین کے خواہاں تھے، مگر وقت کی آندھی نے انھیں اس جانب توجہ مبذول کرنے کی فرصت نہیں دی:

> ''مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ وہ اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہ کام نہیں کر سکتے، تو انھوں نے متعدد اہلِ علم کو دعوت دی کہ وہ اس مخطوطے کو مرتب کر دیں۔ بعض نے مثنوی کے ابتدائی چند اوراق کے مطالعے کے بعد اس بھاری پتھر کو چھوڑ دیا اور بعض نے مولوی صاحب ہی کی طرح عدیم الفرصتی کی وجہ سے معذوری کا اظہار کر دیا۔'' [۸۵]

بالآخر 'قرعۂ فال بہ نامِ منِ دیوانہ زدند' کے مصداق اس مثنوی کی تہذیب اور تصحیح کا کام ڈاکٹر جالبی کا مقسوم ٹھہرا۔ انھوں نے دکنی اُسلوب کی اس مثنوی کو اس کے شایانِ شان انداز میں ترتیب دیا۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی اشاعت سے اردو شاعری کی روایت گم شدہ اور نامعلوم کڑیوں میں اپنا راستہ بناتی ہوئی بہت دور تک نکل گئی۔ انھوں نے اس مثنوی کی وساطت سے روایت کے ان رنگوں کو اُجالنے اور ان اثرات کی نشان دہی کرنے میں دقتِ نظری کا ثبوت دیا، جو دکنی تہذیب کے فکری اور جمالیاتی آہنگ سے پھوٹے تھے۔ انھوں نے اس مثنوی کے تناظر میں اس عہد کی تہذیب اور ادبی روایت کی تلاش کو اس کی حقیقی روح کے منظر نامے تک پھیلا دیا، کیوں کہ ان کے نزدیک:

> ''کسی زبان کی روایت بھی ایک دریا کی طرح ہے، جو صدیوں سے بہہ رہا ہے۔ اس میں ماضی بھی موجود ہے اور حال و مستقبل بھی۔ کہیں یہ دریا بھرا پُرا نظر آتا ہے؛ کہیں خشک و بے آب دکھائی دیتا ہے؛ کہیں اس سے شاخ در شاخ پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں؛ کہیں اس کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے؛ کہیں یہ چھوٹا ہو کر ندی نالے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، لیکن ہیں یہ ایک ہی دریا کی مختلف شکلیں۔'' [۸۶]

تہذیب کے سینۂ دل پر بہتے اس دریا میں پیرتے وہ اس کی تہوں میں مدفون گہر ہائے آب دار ڈھونڈ لائے اور اس گنجینۂ معنی کی طلسم آشنائی میں اس اکائی کو مرتب کرنے میں کامگار رہے، جو کسی بھی تہذیب کی مجموعی فضا میں رچی بسی ہوتی ہے۔ لسانیاتی اور شعریاتی رویے تہذیبی اکائی کے طرزِ اظہار اور رعنائی

احساس کے منفرد اور ممتاز زاویہ ہائے نظر ہیں، یا کم از کم انھیں ہونا چاہیے، کیوں کہ کسی بھی تہذیب کی شناخت اور پہچان اس کے ادب کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور ادب: زبان کی جمالیات سے رنگ اور خوشبو کشید کرتا ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے اس خوشبو کی بدولت دکنی تہذیب کی ادبی روایت کا سراغ لگانے کی سعی کی۔ انھوں نے مثنوی کی ترتیب و تہذیب کے ساتھ ساتھ اس کی شعری معنویت کو بھی اُجاگر کیا۔ انھوں نے تہذیب کے متنوع رنگوں میں، اس اکائی کو تلاش کیا، جو اس کی روح سے عبارت تھی۔ خطِ نسخ میں لکھی گئی اس مثنوی کو پڑھنا، اس کے لفظوں کی تعیین کرنا اور پھر اس کے معنوی آہنگ کو مرتب کرنا یقیناً بہت مشکل کام تھا، مگر ڈاکٹر صاحب کی مستقل مزاجی، ذہانت و فطانت اور فنِ مخطوطہ شناسی کی رمز آشنائی نے ان کا ساتھ دیا اور وہ اس نسخے کی قرأت اور متن کی ترتیب میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے قلمی نسخے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ:

"مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا دنیا میں ایک ہی معلوم نسخہ ہے، جو انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہے، جس کا سائز ۲ء۷ انچ x ۱ء۵ انچ ہے۔ یہ واحد نسخہ بھی ناقص ہے۔ بیچ بیچ میں سے اکثر صفحات غائب ہیں اور آخر میں بھی مثنوی کے کم از کم دو تین صفحات کم معلوم ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے کاتب کے نام اور سنۂ کتابت کا بھی پتا نہیں چلتا۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ مصرعوں کے وسط اور دوسرے مصرعوں کے آخر میں یہ نشان (،) سرخ روشنائی سے دیا گیا ہے۔ پہلے صفحے پر بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنے ہاتھ سے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ فخر الدین نظامی کے الفاظ لکھے ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ: '۸۲۵ھ (یہ سنہ احمد شاہ ولی کی تخت نشینی کا ہے) وفات ۸۳۸ھ م ۱۴۳۴ء۔ ان کے نیچے 'عبدالحق' لکھا ہے۔ اسی صفحے پر یہ بھی لکھا ہوا ملتا ہے کہ: 'علاء الدین بن احمد شاہ ۸۳۸ھ میں تخت نشیں ہوا۔ ۸۶۲ھ میں وفات پائی۔ احمد شاہ ثالث بن علاء الدین ۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ'' [87]

مثنوی کے اس واحد، ناقص الاوسط والا واخر اور نامانوس طرزِ کتابت کے حامل نسخے کی قرأت اور تصحیح بہت مشکل کام تھا، کیوں کہ اس میں لفظوں کی بناوٹ: مروج طرزِ املا سے قطعی مختلف تھی۔ یوں اٹکل سے حروف آشنائی اور ان کی یک جائی صحیح لفظ تک پہنچنے میں حائل تھی۔ ایک ایک لفظ کے دائرے، جوڑ اور نقطے نظر میں رکھتے ہوئے، اس کی حقیقی صورت کا تعین ہفت خواں طے کرنے کے مترادف تھا، مگر ڈاکٹر صاحب نے نہایت کامیابی سے یہ کام مکمل کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۶۷ء میں پہلی بار میں اس مخطوطے سے متعارف ہوا۔ مہینوں اس کے

مطالعے کی کوشش میں لگ گئے۔ آتشین شیشہ لیے گھنٹوں اسے پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک تو رسم الخط اور اس کے اصول، جو کاتب کے پیش نظر تھے، سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ ڈیڑھ سال کی محنت و کوشش اور لغات کے ساتھ سر کھپانے کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ کسی حد تک اسے پڑھ سکوں۔ مجھے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ کاتب مختلف حروف اور ان کے جوڑ کی مختلف شکلیں کس طرح لکھتا ہے۔ مختلف حروف مثلاً: پ، گ، ڑ، ڈ کے لیے وہ کیا عمل کرتا ہے۔ دوسرے حروف وہ کس کس طرح بناتا ہے۔ یہ مشکل بھی ہمیشہ پریشان کرتی رہی کہ لفظ پڑھ لیا، تو اس کی تصدیق کے لیے معنی کی تلاش ہوئی۔ یہ کام بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔ پھر دو سال کے اندر اندر مجھ میں یہ حوصلہ پیدا ہو گیا کہ میں اس مخطوطے کی پہلی نقل تیار کرلوں۔ اس نقل کا مقابلہ جب اصل سے کیا، تو اس میں اتنی کانٹ چھانٹ ہوئی کہ میں دوسری نقل تیار کرنے پر مجبور ہوا۔ دوسری نقل کا مقابلہ جب پھر اصل سے کیا اور ہر لفظ پر غور کیا، تو یہ دوسری نقل بھی اس قابل نہ رہی کہ اسے صاف کیا جاسکے۔ دوسری نقل اور اصل کو سامنے رکھ کر میں نے تیسری نقل تیار کی، جو ۲۱۔ اگست ۱۹۷۱ء کو مکمل ہوئی۔" [۸۸]

مثنوی کے دیباچے میں ڈاکٹر جالبی نے اس کے زمانۂ تصنیف پر تفصیلی بحث کی۔ کہانی کا خلاصہ بھی دیا اور اس کا تفصیلی لسانی تجزیہ بھی کیا۔ لسانی تجزیے میں انھوں نے نظامی کی زبان پر دیگر زبانوں کے اثرات کی بھی نشان دہی کی۔ انھوں نے فخر دین نظامی کی زبان و بیان کے رویوں کو موجود اور مروج قواعد کے اصول و ضوابط کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس مثنوی میں بہ یک وقت: کھڑی، پنجابی، راجستھانی، برجی، گجری، سندھی، سرائیکی اور مرہٹی کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ میں نے جب: پنجابی، سندھی، کھڑی، راجستھانی، برجی اور گجراتی بولنے والوں کو الگ الگ اس مثنوی کے اشعار پڑھ کر سنائے، تو انھوں نے جہاں اور کئی باتیں کہیں، وہاں یہ بات مشترک تھی کہ یہ زبان ان کی اپنی زبان سے قریب ہے اور آج بھی اس کے بہت سے الفاظ ان کے گھروں میں بولے جاتے ہیں۔ اس تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ قدیم زبان، جو اس مثنوی میں استعمال ہوئی ہے، اس میں صدیوں کے میل جول سے متعدد زبانوں کا خون شامل ہے اور اسی خاندانی شباہت کی وجہ سے مختلف زبانیں بولنے والے اسے اپنی زبان سے قریب تر

پاتے ہیں۔ معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی حالات کے ساتھ اردو کا ذخیرۂ الفاظ، لہجے اور اسالیب تو بدلتے رہے، لیکن یہ ہمیشہ سب ہند آریائی زبانوں کی ایک زبان بن کر پروان چڑھتی رہی، اسی لیے میں اس زبان کو برِ صغیر کی ساری ہند آریائی زبانوں کا عادِ اعظم مشترک کہتا ہوں۔'' [۸۹]

ڈاکٹر صاحب نے مثنوی کے متن کی قرأت میں ژرف نگاہی اور احتیاط پسندی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اپنے خوانا متن کے ساتھ صفحہ بہ صفحہ اصل مخطوطے کا عکس بھی دے دیا، تاکہ ان کی قرأت [Readings] کی روشنی میں اصل مخطوطے کو بھی پڑھا جا سکے۔ یہ طریقۂ تدوین ان کے اپنے کام پر اعتماد اور یقین کی علامت ہے۔ ناخوانا متن کو تدوین اور مخطوطہ شناسی کے جملہ رموز و علائم کی مدد سے قابلِ خواندگی بنانا نہایت اہم عمل ہے۔ اس کی اہمیت اس وقت دوچند ہو جاتی ہے کہ جب پیشِ نظر مخطوطے کا املا اور رسم الخط نامانوس بھی ہو، اور جا بہ جا کاتب کو بھی کھل کھیلنے کا موقع ملا ہو، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان تمام مسائل کے باوجود اس کی قرأت، اس کی تصحیح اور ترتیب میں اپنی دقتِ نظری اور عرق ریزی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے فرہنگ بھی مرتب کی اور اس ضمن میں بھی اپنی مہارتِ فن کا ثبوت دیا۔ آخر میں مثنوی میں مذکور شخصیات اور بہمنی عہد کے سلاطین کے احوال بھی مرتب کیے، تاکہ مثنوی کی تفہیم میں سہولت اور آسانی رہے۔ انھوں نے مثنوی کی ترتیب اور تہذیب میں ان جملہ اصول و ضوابط سے استفادہ کیا اور انھیں بروئے کار لائے، جو متن کی قرأت اور اس کی تفہیم میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ البتہ ڈاکٹر صاحب نے کاتب اور کتابت کے بارے میں روشنی نہیں ڈالی اور نہ ہی اس کے سنۂ کتابت کے تعین میں کوئی نکتہ آفرینی کی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ان کے اس تدوینی کام کو ایک اہم کارنامہ بتایا، لیکن کاتب اور کتابت کے سلسلے میں لکھا کہ:

''قلمی نسخے کے کاتب کے بارے میں جالبی صاحب نے کچھ زیادہ نہیں لکھا، یہ مسئلہ قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اسے معاصر نسخہ جانے، یا بعد کا مخطوطہ شمار کرلے۔ نواب جمیل الدین عالی نے اسے چھ سو برس کا مسودہ قرار دے کر معاصر نسخہ گردانا ہے۔ اس سے لسانیات کے طالب علموں کے لیے کچھ الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ کتاب میں ترقیمہ نہیں ہے، یہ بھی صحیح کہ محض خط سے زمانے کا تعین پوری طرح ممکن نہیں، لیکن آج کے زمانے میں فنون نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ کسی لیبارٹری میں آسانی کے ساتھ کاغذ اور روشنائی کا زمانہ قطعی طور پر معین ہو سکتا تھا۔'' [۹۰]

تحقیق اور تدوین کے یہ رنگ ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت کی ایک جہت اور ایک اظہاریے کے

عکاس ہیں۔ انھوں نے اس جہت کو اپنے تحقیقی اور تنقیدی اُسلوب کی رعنائی سے تخلیقی طرزِ احساس کی رعنائی میں آشکار کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے متون کی تدوین میں اس فن کے جملہ رموز و علائم سے بھی اخذ و استفادہ کیا اور اپنے تنقیدی شعور کی دل کشی سے بھی......اور اس کی جمالیات کو مؤثر آہنگ میں مرتب کرنے کی بھی طرح ڈالی۔ انھوں نے ان تین متون کی تدوین اور ان کے لسانی مطالعات کے تناظر میں دکنی تہذیب کے ادبی رجحانات اور ان کے محرکات کا مطالعہ کیا اور اس اکائی کو تلاشا، جو اس تہذیب کی روح و رواں تھی۔ اس اکائی کا رنگ و آہنگ انھوں نے لسانیاتی اور شعریاتی پیکروں سے مرتب کیا اور ادب اور زبان کے حوالے سے اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا۔ زبان اور اُسلوب کے بدلتے تناظر اور گھٹتے بڑھتے معنوی ابعاد، ان کے روزنِ تحریر سے منعکس ہوئے۔ انھوں نے ان شاہ پاروں کی تدوین اور ان تخلیق کاروں کے احوال کی تہذیب اور تلاش میں تاریخی، تہذیبی اور فکری زاویہ ہائے نظر سے بھی استفادہ کیا اور ان متون کے نامانوس الفاظ کی فرہنگ اور ان کے معنوی جہات کی عکس بندی بھی ان کے پیشِ نظر رہی اور یوں وہ ان متون کی مثالی تدوین کاری میں کامیاب ہوئے۔

گنجینۂ معنی کی طلسماتی اپیل

جب غالب نے لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم کدہ کہا، تو حقیقت میں اس نے لفظ کے باطن میں موجود اس کے معنوی نظام اور اس کے طرزِ احساس کی رنگا رنگی کی طرف اشارہ کیا کہ کس طرح لفظ کے داخلی آہنگ میں طرزِ احساس کی نیرنگی کا منظر نامہ موجود ہوتا ہے، کہنے کا مطلب یہ کہ لفظ کے خارجی اور داخلی پیکر میں ایک ایسا جہانِ معنی موجود ہوتا ہے، جو اپنے راز ہر کسی پر منکشف نہیں کرتا، کیوں کہ لفظ کی کہانی اس کے معنوی آہنگ میں پوشیدہ ہوتی ہے، لیکن جو تخلیق کار لفظ اور اس کی معنوی جہتوں کے سربستہ رازوں کے انکشاف پر کمرِ ہمت کس لے، اس پر لفظ اپنی معنوی تہ داری منکشف کر دیتے ہیں۔

لفظ شناسی محض تکنیکی اور میکانکی عمل نہیں، یہ تخلیقی عمل بھی ہے۔ لفظ کے باطن میں موجود مرکزی تصور تک رسائی، دراصل لفظ کی متنوع جہتوں میں سفر آشنائی کے مترادف ہوتا ہے۔ اس سے آگہی اور اس کی کلی تفہیم میکانکی طرزِ احساس سے ممکن نہیں ہوتی، بل کہ اس کا شعور اس تہذیب میں محوِ سفر رہ کر ہی حاصل ہو سکتا ہے، جو لفظ کے باطن میں موجود ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی جہاں ایک طرف تحقیق، تنقید اور تراجم سے وابستہ ہیں، وہیں دوسری طرف لفظ شناسی اور اصطلاح سازی: ان کی فکری معنویت کو ایک نئی جمالیاتی اساس فراہم کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''لسانیات سے بھی مجھے گہری دل چسپی ہے۔ اشتقاق کی تلاش میں ایک لطف آتا ہے۔ لفظوں کے معنی تلاش کرنے اور متعین کرنے میں مجھے ایک خاص کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔'' [۹۱]

[۲]

قدیم اردو کی لغت ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو الفاظ کی فراہمی سے لے کر، ان کے معنی کی تعیین تک کے مراحل میں، ان کی دقتِ نظری اور دیدہ وری کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے تین سو تین صدیوں پر پھیلے اردو ادب کے سرمائے کی تفہیم اور معنوی تعبیر کے سلسلے میں اس لغت کو مرتب کیا:

> ''اس لغت کی داستان یہ ہے کہ تاریخِ ادبِ اردو پر کام کرتے ہوئے مجھے

سیکڑوں مخطوطات اور بیاضوں کے صحراؤں سے گزرنا پڑا۔ دورانِ مطالعہ اکثر ایسے لفظوں سے واسطہ پڑا، جو میرے لیے اجنبی تھے۔ میں ان لفظوں کو ایک کاپی میں لکھ لیتا اور پھر سیاق و سباق کے حوالے، مختلف لغات کی مدد اور اہلِ علم سے گفتگو کرنے کے بعد، جب ان لفظوں کے معنی متعین ہو جاتے، تو ان کے سامنے لکھ دیتا۔ کچھ عرصے بعد میں نے یہ کیا کہ ہر وہ لفظ، جو قدیم ادب میں استعمال ہوا، اسے معنی اور حوالے کے ساتھ ایک کارڈ پر لکھ کر رکھ لیتا۔ یہ کام ۱۹۶۱ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۷۱ء میں ختم ہوا۔ جب کام ختم ہوا، تو تقریباً اٹھارہ ہزار الفاظ کا ذخیرہ میرے پاس تھا۔ اس ذخیرے کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان کو مرتب کر دیا جائے، تو یہ لغت ان لوگوں کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگی، جو قدیم اردو کی مطبوعہ کتب، مخطوطات اور قلمی بیاضوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے قدیم اردو کی یہ لغت مرتب کی ہے۔'' [۹۲]

نویں صدی سے لے کر بارھویں صدی ہجری کے ربع اوّل تک پھیلا ہوا، یہ ادبی منظرنامہ نامانوس اور عسیر الفہم الفاظ کی کثرت سے مملو تھا۔ ان کے معنوی ابعاد کی حد بندی اتنا آسان کام نہ تھی۔ دکنی زبان کا رنگِ سخن اور ذخیرۂ الفاظ کسی قدر اجنبی اور مشکل تھا۔ گنجینۂ الفاظ کی اس طلسماتی اپیل سے معنوی خدوخال کی جلوہ آرائی جس رنگ و آہنگ میں مرتب ہوئی، وہ محض لغت شناسی تک محدود نہیں رہا، بل کہ الفاظ کی اوٹ سے تہذیب شناسی کے منظر بھی نمایاں ہوئے۔

قدیم اردو کی تشکیل اور تہذیب میں مختلف زبانوں اور بولیوں کے اثرات موجود تھے۔ ان اثرات نے قدیم اردو کے تیوروں کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں جو کردار ادا کیا، اس کے رنگ اور خوشبو اس لغت کے صفحات پر جلوہ گر ہوئے۔ اس لغت کے الفاظ کی جمع بندی اور فراہمی کسی دوسرے کی کاوش سے نمود پذیر نہیں ہوئی، بل کہ ڈاکٹر صاحب نے کوئی دو سو قلمی مخطوطات اور قدیم مطبوعات کی وساطت سے الفاظ کے ذخیرے کو اکٹھا کیا، اس کے استعمال اور طرزِ احساس سے ان کے معنوی رنگوں کے تعین اور ان کی جمالیاتی حد بندی کا فریضہ انجام دیا۔ وہ لفظوں کے تناظر میں ان کے معنوی دروبست کی تشکیل کے مختلف اور متنوع رویے مرتب کرتے رہے اور یوں اس لغت کی صورت نکھرتی رہی۔ تاریخِ ادبِ اردو کے گجراتی اور دکنی دور کے زبان و ادب کے تجزیاتی مطالعات اور قدیم اردو کے متون کی ترتیب و تہذیب کے عمل میں وہ براہِ راست الفاظ اور ان کے استعمال سے متعلق رہے۔ انھوں نے اس عمل کے دوران میں متنوع رنگوں اور خوشبوؤں کے حامل پھول چنے اور انھیں نہایت قرینے سے اس لغت کے

سر سبد میں سمو دیا۔ ان پھولوں کے باطن سے پھوٹتے رنگ اور ان کی مہک: تہذیب کے لسانی اور معنوی پیکر اُجالتی رہی۔ معنوی روایت اور اس کے تسلسل کا یہ فکری قرینہ آج بھی اپنی تازگی اور تازہ کاری کے سبب بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔

دکنی ادب کے لغت کی تشکیل اور تہذیب کے عمل میں چوں کہ ذخیرۂ الفاظ کے معنوی خدوخال اُبھارنے میں قیاس کو بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل تھی، اس لیے یہ قیاس آرائی اگر وجدانی اور مکاشفاتی رنگ و آہنگ سے لذت گیر نہ ہوتی، تو معنی کے درست تعین کی یہ روایت اپنی اصل اور حقیقی صورت سے مملو نہ ہو پاتی۔

ڈاکٹر صاحب نے الفاظ اور ان کے افعال کی متعدد صورتوں اور مخطوطات میں ان کے استعمال کے طرزِ احساس کو سامنے رکھا اور یوں معنوی فضا کو متعین کیا۔ اس طرح محض قیاس ان کا مطمحِ نظر نہیں رہا، بل کہ اس سے کہیں بڑھ کر وہ تہذیبی آثار و فرہنگ کے زیرِ اثر وجدان کی نیرنگی سے بھی لذت آشنا رہے۔ اس طرح لغت یہ اپنی دو سطحوں [یعنی ذخیرۂ الفاظ کی فراہمی اور معنوی خدوخال کی جلوہ آرائی] پر دکنی ادبیات کی تفہیم میں کامگار رہا۔ مشفق خواجہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''لغت نویس عام طور پر اپنے پیش روؤں کے چراغ سے چراغ جلاتے ہیں، لیکن مذکورہ صورتِ حال کے پیشِ نظر جالبی صاحب کے لیے اس قسم کی کوئی سہولت موجود نہ تھی۔ بعض دکنی کتابوں میں فرہنگیں ضرور ملتی ہیں، لیکن ان میں درج شدہ معانی بڑی حد تک قیاسی ہیں۔ پھر ان فرہنگوں میں الفاظ کے معنی کا تعین کرتے ہوئے ہر فرہنگ نگار نے لفظ کے اسی استعمال کو پیشِ نظر رکھا ہے، جو اسے اپنی مرتبہ کتاب میں ملا۔ جالبی صاحب نے چوں کہ ایک ایک لفظ کو کئی کئی کتابوں میں دیکھا ہے، اس لیے ان کے سامنے ہر لفظ کے استعمال کی متعدد مثالیں تھیں، جن کی وجہ سے انھیں صحیح معنی متعین کرنے میں بڑی آسانی رہی۔ کسی زندہ زبان کے لفظ کے معنی متعین کرتے ہوئے لوگوں کی بول چال بہت سی مشکلوں کو دور کر دیتی ہے، لیکن جو زبان صرف کتابوں میں نظر آئے، اس کے الفاظ کے معانی متعین کرنے کے لیے لغت نگار کا مطالعہ وسیع ہونا پہلی شرط ہے۔ جالبی صاحب نے یہ شرط بہ خوبی پوری کی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ زیرِ نظر لغت اس موضوع پر حرفِ آخر ہے، لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آیندہ جو لوگ اس موضوع پر کام کریں گے، ان کے لیے جالبی صاحب کی لغت بنیادی مواد کا کام دے گی۔'' [۹۳]

قدیم اردو کی لغت کی ترتیب وتہذیب سے قبل بھی، اس میدان میں کچھ محققین نے دادِ تحقیق دی، مگران میں نہ تو الفاظ کا وہ پھیلاؤ ملتا ہے اور نہ ہی معنوی رنگوں کی نمود، جو ہمیں ڈاکٹر صاحب کے اس لغت میں دکھائی دیتی ہے۔ اس لغت میں چوں کہ دکنی دور کے اکثر و بیش تر شعرا کے شعری سرمائے کا رنگ رس الفاظ کی اوٹ سے دعوتِ نگاہ دے رہا ہے، اس لیے اس کے تناظر میں اس دور [کے ادبیات] کی تفہیم اور ان شعرا کے طرزِ فکر کی تعبیر آسان ہوگئی۔ ہندوی اسطور اور الفاظ کے باطن میں موجود طرزِ احساس کا آہنگ: لفظ کے خارجی پیکر میں ڈھل کر تہذیب کے متنوع رویوں کا آئینہ دار بن گیا۔ اس کی معنوی نمود اس کے بدلتے ہوئے مزاج اور معیار کی دلیل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس لغت میں الفاظ کی فراہمی اور ان کی معنوی تعین کے ساتھ املائی صورتوں کو بھی اہمیت دی۔ مخطوطات میں نامانوس رسم الخط اور کاتبوں کی حاشیہ آرائیوں نے الفاظ کی صورتوں کو جس طرح متشکل کیا، اس سے معنی کی تعبیر اور اس کے فکری قرینے الجھ کر رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی مطالعاتی وسعت نے، نہ صرف ان الجھنوں کو سلجھایا، بل کہ ان کے معنوی آہنگ کو بھی اُبھارا۔ بہ قول ڈاکٹر محمد علی اثر:

> ''یہ لغت دراصل محققین، ماہرینِ زبان اور اہلِ علم کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعے کے بغیر مستقبل میں کسی بھی قدیم اردو کی لغت کی ترتیب و تدوین ادھوری اور نامکمل رہے گی۔'' [۹۴]

یہ لغت بہ ذاتِ خود نہ مکمل ہے اور نہ حرفِ آخر، اس میں اضافے کی گنجائش بھی یقیناً موجود ہے، لیکن اس کے باوجود یہ بہترین لغت ہے۔ قدیم اردو لغت کا اس سے بہتر کوئی نمونہ موجود نہیں۔ فردِ واحد نے اس کی جو صورت گری کی، وہ اس کے افادی پہلوؤں کی دلیل ہے، کیوں کہ:

> ''کسی موضوع پر پہلی مرتبہ کام کرنے والے، بعد میں کام کرنے والے والوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ ایک چراغ روشن کرتے ہیں، تاکہ دوسرے اپنے چراغوں کو روشن کرسکیں۔ جالبی صاحب کا یہ کام اپنے موضوع پر بڑی حد تک پہلا کام ہے۔ خوبیوں کا پلا بھاری ہے اور خامیاں ایسی نہیں ہیں کہ جن کی تصحیح آیندہ ایڈیشن میں نہ ہوسکے۔'' [۹۵]

[۳]

۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر جالبی نے قومی انگریزی اردو لغت مرتب کیا۔ اگرچہ انگریزی اور اردو لغات کی باہمی تہذیب اور تدوین کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس سلسلے کا پہلا لغت ۱۵۹۵ء میں اشاعت پذیر [☆۲] ہوا، اس کے بعد تو کتنے ہی لغات مدون ہوئے، جوان دونوں زبانوں کے مابین فکری اور

معنوی طرزِ احساس کی صورت پذیری کا مرقع ہیں۔ اپنے اپنے زمانوں میں ان کا دائرۂ اثر اور ان کی معنوی گرفت بہت مضبوط رہی، مگر نئے دور اور اس کے بدلتے ہوئے علمی اور فکری مزاج اور اس کے نت نئے تقاضوں کی بدولت، ان میں اس زمانے کی جدید حسیت کا ساتھ دینے اور اس کی علمی ضرورتوں اور ان کی معنوی صورت کو متعین اور متشکل کرنے کا یارا نہیں رہا، تو ایک ایسے لغت کی ضرورت پیدا ہوئی، جو عصری تقاضوں کی مختلف اور متنوع ضرورتوں کا احساس کرتے ہوئے ایک ایسے معیاری آہنگ کو مرتب کرے، جو اس عہد کے علمی اور فکری خدوخال اور طرزِ احساس کی بوقلمونی کو اپنے اندر سمو سکے:

> ''لغت نویسی ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے اور بالخصوص اس وقت یہ کام اور دشوار ہو جاتا ہے، جب لغت ذولسانی ہو۔ جب ایک زبان کے الفاظ ومحاورات کو دوسری زبان میں متشکل کیا جاتا ہے، تو نہ صرف زبان کو نئے سانچوں میں ڈھالنا پڑتا ہے، بل کہ نئے علوم وفنون کے زیرِ اثر نئے الفاظ، مرکبات اور اصطلاحات بھی وضع کرنی ہوتی ہیں۔ اس عمل کے دوران اس زبان کے لسانی مزاج کو بھی سامنے رکھنا ہوتا ہے، جس زبان میں یہ نئے تصورات ڈھالے جا رہے ہیں۔ اس عمل سے لسانی امتزاج وجود میں آتا ہے اور وہ زبان نئی جہتوں سے آشنا ہوتی ہے اور اس کی قوتِ بیان بڑھتی اور سیکڑوں نئے الفاظ، اصطلاحات ومرکبات اس کے دامن میں سمٹ آتے ہیں۔'' [۹۶]

قومی انگریزی اردو لغت ایک ایسا لغت ہے، جس میں امریکی اور برطانوی لفظ کے دو املائی رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں اور معنوی سطح پر اردو کے ساتھ ساتھ تمام پاکستانی زبانوں کے مشترک فکری اور معنوی عناصر بھی۔ اس میں مختلف علوم وفنون کے الفاظ اور اصطلاحات کے معانی اور مترادفات کا انتخاب اور معیار بندی اس انداز سے کی گئی کہ یہ کام محض فنی اور تکنیکی دوائر سے نکل کر ذوقی اور تخلیقی آہنگ سے آشنا ہوا۔ یہ لغت نہ صرف لفظ کے مرکزی تصور کے در وا کرتا ہے، بل کہ اس تصور، یا خیال کے قریب ترین متبادل کو بھی عکس انداز کرتا ہے، جو لفظ کے پیکر میں موجود ہوتا ہے۔ اس سے الفاظ کی معنوی رنگارنگی اور قوتِ اظہار کی بوقلمونی نئے رنگوں کے پیکر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس لغت سے اردو زبان کی پوشیدہ فکری اور معنوی توانائیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک لفظ کے اندر معنوی جہات کی کس قدر نیرنگی پوشیدہ ہے، کیوں کہ لفظ کے آنگن میں، اس کا سارا معنوی نظام اپنے جملہ رنگوں کے ساتھ جلوہ آرا نہیں ہوتا۔ ہم لفظوں کے ایک آہنگ، یا جہت کا ادراک رکھتے ہیں اور اس کی متنوع صورتوں کو اس کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ منعکس نہیں کرتے، جب کہ ڈاکٹر صاحب نے اس لغت میں کسی بھی لفظ اور اس کی متنوع صرفی ونحوی صورتوں کے معنوی 'Shades' کو محفوظ کرنے کا جتن کیا اور

اس طرح اردو کا لسانی مزاج معانی اور مفاہیم کی نئی جہتوں سے آشنا ہوا:

"اس لغت میں آپ کو اردو زبان بدلتی؛ نئے شعور، نئے تصورات اور نئے مفاہیم کو سلیقے سے ادا کرتی ہوئی محسوس ہوگی۔ نئے مفاہیم اور نئے تصورات کو ادا کرنے کے لیے ایک نیا اندازِ اظہار اختیار کیا گیا ہے۔ ممکن ہے لسانی امتزاج و لسانی تشکیل کے اس عمل میں آپ کو کہیں کہیں اجنبیت کا احساس ہو، لیکن وقت، استعمال اور رواج کے ساتھ یہ اجنبیت دور ہوتی اور نکھرتی ہوئی نئی صورتیں سامنے آتی چلی جائیں گی۔ یہ عمل :اردو زبان کے ارتقائی عمل، بالخصوص سائنسی و علمی زبان کے عملِ ارتقا کو سہل اور تیز تر کرے گا۔ حتی الوسع ہر انگریزی لفظ، یا اصطلاح کا اردو متبادل بھی دیا گیا ہے۔ اس امکان کے پیشِ نظر کہ وہ لفظ، یا اصطلاح جو ہم نے دی ہے، آپ کی ضرورت یا خواہش کو پورا نہ کرتی ہو، یا آپ کو پسند نہ ہو، ہم نے اس لفظ یا اصطلاح کے اندر موجود مرکزی تصور، یا مفہوم کو بھی بیان کر دیا ہے، تاکہ اس تصور سے واقف ہو کر آپ اپنی قوتِ تخلیق سے حسبِ خود نیا لفظ، یا اصطلاح وضع کر سکیں۔ یہ عمل ساری لغت میں قریب قریب ہر لفظ کے ساتھ برتا گیا ہے۔ آپ کی ضرورت و خواہش کے مدِنظر مترادفات بھی دیے گئے ہیں، تاکہ آپ ان مترادفات میں سے حسبِ ضرورت اپنا مطلوبہ لفظ منتخب کر سکیں۔" [97]

قومی انگریزی اردو لغت فرد اور معاشرے کی بدلتی اور نت نئی ضرورتوں میں ڈھلتی ہوئی صورتوں کا عکاس ہے۔ ہماری معاشرتی، فکری اور علمی زندگی تبدیلیوں کے جس رنگ رس سے آشنا ہوئی، اس کا معنوی آہنگ اور اظہارِ بیان ایک ایسی وسعت آشنائی کا متقاضی ہے، جو لمحۂ موجود کی سائنسی اور تکنیکی تقاضوں کی ہمہ گیری کو تہذیبی زندگی کی اکائی میں متشکل کر سکے۔ اس سلسلۂ خیال کی علمی صورت اور اس کا معنوی تناظر اس لغت کی بدولت حسنِ خیال کی جمالیات کو ہماری علمی اور فکری زندگی کا آئینہ بنا دیتا ہے اور اس لغت کے تناظر میں علمی، سائنسی اور تکنیکی رویے مختلف اور متنوع علوم اور فنون کی اوٹ سے متشکل ہوتے ہیں۔ یہ لغت اپنے علمی آہنگ کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے لسانی رویوں کا ترجمان بھی ہے۔ کوئی بھی زبان کس طرح اپنے زمانے کی جدید علمی حسیت اور فکری طرزِ احساس کی ترجمانی کے آہنگ کو مرتب کرتی ہے اور کس طرح اس کا معنوی کینوس وسعت آشنا ہوتا ہے، اس نکتے کی صحیح تفہیم اس لغت کے مطالعے کے بعد ہی آشکار ہو سکتی ہے، کیوں کہ عصرِ حاضر کی سائنسی اور علمی پیش رفت کا ساتھ نبھانے اور انگریزی زبان کے ہم قدم ہونے کا احساس اردو کو لفظ سازی کے اسلوب کا پتا

دیتا ہے۔ یہ لغت اردو زبان کے لسانی مزاج اور اس کے غیر معمولی لچک دار رویے کا آئینہ دار بھی ہے اور اس کی معنوی رعنائی کا ترجمان بھی۔ لفظ سازی کے عمل سے یہ لغت ایک ایسے وسیلۂ اظہار کا اشاریہ مرتب کرتا ہے، جو نئے زمانے کے اسلوب کا علم بردار بھی ہے اور اس کی وسعت آشنائی پر گواہ بھی۔ اس سے لفظیات کی نیرنگی اور بوقلمونی تازہ اور توانا آہنگ کی رفعتوں کا اظہاریہ بن جاتی ہے۔ یہ اپنے عہد میں مروج اور نئے رنگ و آہنگ سے مملو ہوتے علوم وفنون کی تازہ کاری اور ان کے داخل میں موجود رعنائی خیال کی کوملتا کی تصویر گری میں معاون ہے۔ یہ لغت ہمارے خیال کی حاشیہ آرائی اور اس کے تموج کے آہنگ کی صورت آرائی کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے دامن میں طرزِ احساس اور حسنِ خیال کے رنگا رنگ پھول اپنی بہار کا منظر دکھا رہے ہیں:

(۱) یہ لغت اردو زبان کے لسانی مزاج کی اس ہمہ گیری اور آفاقیت کا ترجمان بھی ہے کہ جس میں پاکستانی زبانوں کے رنگ رس ان کے تہذیبی عناصر کی کارفرمائی سے اردو زبان اور اس کے کلچر سے باہم آمیخت ہو گئے۔ اس طرح اردو زبان کا کینوس: معنوی نظام کی وسعت آشنائی سے ہم آہنگ ہو کر، پاکستان گیر جذبوں کا اشاریہ بن گیا۔

(۲) یہ لغت عصرِ حاضر کی متنوع علمی ضرورتوں کا احاطہ کرتا ہے، کیوں کہ:

> "اس میں نہ صرف امریکہ، برطانیہ، اسکاٹ لینڈ، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے مخصوص انگریزی الفاظ و محاورات، بل کہ دو سو سے زیادہ علوم وفنون کی اصطلاحات بھی شامل ہیں۔ یہ سب وہ الفاظ، محاورات اور اصطلاحات ہیں، جو معیاری انگریزی تحریروں میں استعمال ہوئے ہیں۔" [۹۸]

(۳) اس لغت میں کسی بھی لفظ کے باطن میں موجود مرکزی تصور یا خیال کو اس انداز سے تشکیل دیا گیا کہ اس لفظ سے وابستہ فکر وفرہنگ کا سارا خزانہ متشکل ہو گیا، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ کے مرکزی تصور اور اس کے مترادفات کو اس طرح منتخب کیا گیا کہ لفظ کی اوٹ سے اس کا سارا معنوی نظام لو دینے لگا۔

(۴) جہاں الفاظ کو پڑھنے میں، مشکل در آتی تھی، یا ایسا ہونے کا خدشہ تھا، وہاں ان پر اعراب لگانے کا اہتمام کیا گیا، تاکہ لفظ کی صوری اور صوتی صورت مجروح نہ ہو اور اسے اس کے صحیح تلفظ کے مطابق ادا کیا جا سکے۔

(۵) امتزاجی اُسلوب اس لغت کی ایک اور اہم خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے معنوی حوالے سے اردو زبان کے اردو پن یا اردو آہنگ کو قائم رکھنے کے لیے جو لسانی عمل اختیار کیا، وہ ان کی لفظ شناسی اور اس کے امتزاجی پہلوؤں کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر عطش درانی کے بہ قول:

''اردو پن کو برقرار رکھتے ہوئے لسانی امتزاج کا عمل آسان نہیں۔ آپ مصنوعی طور پر الفاظ جمع نہیں کر سکتے۔ کوئی لفظ اس وقت تک اردو زبان کا حصہ نہیں بن سکتا، جب تک کہ وہ لفظ معانی کی خاص صورت لیے ہوئے نہ ہو اور اردو کے سانچے میں ڈھل جانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ پھر اس سے بڑا مسئلہ لفظ کے چلن اور رواج کا ہے۔ کتنے ہی الفاظ و مرکبات اہلِ علم نے وضع کیے؛ اردو کی سان پر چڑھے اور غائب ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لسانی امتزاج کا یہ عمل اس لغت میں وسیع پیمانے پر کیا ہے۔'' [۹۹]

[۴]

فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ کی دو جلدوں میں ترتیب و تہذیب ڈاکٹر جالبی کا اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی مطبوعات کو پاکستانی ذخیرہ ہائے کتب میں تلاش کر کے، ان سے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کو یک جا کر دیا۔ ان کی اس مساعی سے اس علمی، فکری اور تاریخی سرمائے کا معتدبہ حصہ محفوظ ہو گیا۔ یہ ذخیرہ اردو زبان کے گزرے کل کی قدروں کا اشاریہ بھی ہے اور آنے والے کل کا اظہاریہ بھی۔ اس سے زبان کی علمی، تخلیقی اور تکنیکی قوت کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر یہ زبان علمی اور فنی آثار کے انجذاب اور ان کے اظہارات پر قادر ہے۔ اس فرہنگ کی تدوین اور ترتیب کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ:

''اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ ہمارا علمی اور تاریخی ورثہ ہیں۔ اس سرمائے میں برِ صغیر کے بہترین دماغوں کی انفرادی و اجتماعی کاوشیں شامل ہیں۔ سقوطِ حیدر آباد [دکن] کے فوراً بعد جب اردو ذریعہ تعلیم کی روایت وہاں ٹوٹی، تو یہ سارا علمی سرمایہ بھی منتشر ہو گیا۔ اب جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، اس سرمائے کی شیرازہ بندی دشوار تر ہوتی جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ سرمایہ یک جا و مرتب کر کے شائع کیا جاتا، تاکہ یہ نہ صرف محفوظ ہو جاتا، بل کہ وضعِ اصطلاحات کی جدید روایت سے بھی اس کا رشتہ قائم ہو جاتا۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے کم و بیش اس سارے سرمائے کو کھنگالا، جو پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ تھا اور اسے یک جا کر کے مرتب کر دیا۔'' [۱۰۰]

اردو زبان میں اصطلاحات سازی کی روایت نئی نہیں، جب یہ زبان مختلف علوم و فنون کے علمی، فکری اور تکنیکی اظہار کا ذریعہ بنی، تو اس میں وضعِ اصطلاحات کے عمل کا آغاز ہوا، مگر

اس روایت میں تیزی اور تواتر اس وقت پیدا ہوا:

''جب ۲۶۔ اپریل ۱۹۱۷ء کو نظامِ دکن نے یہ فرمان جاری کیا کہ: اپنی تخت نشینی کی یادگار میں سلطنتِ آصفیہ میں ایک جامعہ کے قیام کا حکم دیتا ہوں، جس کا نام جامعہ عثمانیہ ہوگا، اس فرمان کے چار مہینے کے اندر اندر ۱۴۔ اگست ۱۹۱۷ء کو شعبۂ تالیف و ترجمہ کا قیام عمل میں آ گیا، جس کے سربراہ مولوی عبدالحق مقرر کیے گئے۔ اس شعبے کا مقصد یہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ کے لیے ضروری کتب لکھوائی اور ترجمہ کرائی جائیں، تاکہ یہ کتابیں جامعہ عثمانیہ میں درسی کتب کے طور پر استعمال کی جاسکیں۔ جامعہ عثمانیہ میں ذریعۂ تعلیم چوں کہ اردو زبان تھی، اس لیے وہاں اصطلاح سازی کے کام میں بھی غیر معمولی اور مفیدِ مقصد پیش رفت ہوئی۔''[۱۰۱]

کسی بھی زبان کی ترویج اور ترقی کے لیے اصطلاحات سازی کی اہمیت مسلمہ ہے۔ زبان کی فکری توانائی اور معنوی جمالیات کا انحصار اصطلاح کی تہذیب سے وابستہ ہوتا ہے۔ تراجم: اصطلاحات کے پھیلاؤ کو ایک ایسے معنوی قرینے میں منعکس کرتے ہیں کہ زبان کا علمی، فکری اور فنی سرمایہ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کے فکری اور معنوی خدوخال کا عکاس بن جاتا ہے۔ مختلف تہذیبوں میں متنوع علوم و فنون کے پھیلتے ہوئے معنوی آفاق اصطلاحات کے پیکر میں ڈھل کر علم اور آگہی کا وسیلہ بن جاتے ہیں، کیوں کہ کسی بھی زبان میں علم اور فن کی کوئی بھی اصطلاح جب دوسری زبان کے گھر آنگن میں اترتی ہے، تو وہ اپنے معنوی پس منظر کو دوسری زبان کے تہذیبی پھیلاؤ میں عکس انداز کر دیتی ہے۔ اس طرح زبانوں کے مابین اشارات کی تشکیل ایک نئے معنوی آہنگ میں مرتب ہوتی ہے۔ مولانا وحید الدین سلیم کے الفاظ میں:

''اصطلاحیں، دراصل اشارے ہیں، جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو منتقل کر دیتی ہیں۔''[۱۰۲]

گویا خیالات کی پیکر تراشی اصطلاح کے اشاراتی اُسلوب اور آہنگ سے جلوہ گر ہوتی ہے، اس لیے اس کی معنوی ترسیل اور جلوہ آرائی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہوتا۔ یہ زبان کے علمی اور فنی اظہارات کو نئے معنوی آفاق سے ہم آہنگ کرتی ہے اور یوں کوئی بھی زبان اصطلاحات سازی کے عمل میں، اپنے زندہ رہنے کے وسیلے ڈھونڈ لیتی ہے۔

ترجمہ نگاری یا تخلیقِ نو کا اشاریہ

ترجمہ نگاری: دو تہذیبوں کے مابین علمی مکالے اور فکری معانقے کا نام ہے۔ یہ دو زبانوں کے تخلیقی اور فکری سطح پر باہمی اظہاریے سے عبارت ہوتا ہے۔ ایک زبان کے رنگ رس اپنی تہذیبی صداقتِ احساس کے ساتھ دوسری زبان کے رنگ و آہنگ سے باہم آمیخت ہو کر، تخلیقِ نو کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ ترجمہ نگار: اس عمل کے دوران میں اس تخلیقی رعنائی اور طرزِ احساس کے بطون میں سفر آشنا رہتا ہے، جو ایک تخلیق کار کے فکری اور جذباتی تجربے سے پھوٹتے ہیں۔ تخلیق کار: تخلیقی عمل میں اپنے مشاہدے اور تجربے کے رنگ اور آہنگ سے ایک ایسا وجدانی اور مکاشفاتی ماحول تخلیق کرتا ہے، جو اس کے فکری اور جمالیاتی رویوں کا ترجمان ہوتا ہے، مگر ترجمہ نگار جب اسی راستے سے ہو کر، اس تخلیقی عمل کی رعنائی کو اپنے فکر اور احساس کا حصہ بناتا ہے، تو اس فن پارے کو وہ قدر و قیمت نصیب نہیں ہوتی، جو اصل تخلیق کا مقدر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صدیق جاوید کے بہ قول:

> ''ترجمہ نگاری آسان اور سہل کام نہیں۔ یہ نہ صرف عرق ریزی، بل کہ ایثار پسندی کا مطالبہ کرتی ہے، کیوں کہ کسی زبان میں ترجمے کا کام شخصی اعتبار سے خاصا خسارے کا کام ہے۔ اس کا عام طور پر اندازہ نہیں کیا جاتا کہ ان غیر تخلیقی گویا غیر شخصی و غیر ذاتی کاموں میں کس قدر محنت صرف ہوتی ہے اور کتنا خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے، مگر اس کے باوجود یہ کام ثانوی نوعیت ہی کا رہتا ہے۔ ترجمہ شدہ کتابیں: مصنف یا مصنفین ہی سے منسوب رہتی ہیں۔ مترجمین کا نام تو محض برائے بیت آتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ حضرات گھاٹے کا کام کرتے ہیں۔ یہاں اگر صرف مترجم کے حوالے سے کسی قدر تامل کے بعد بات کی جائے، تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظری تقسیم اور مقسوم کے تحت مترجم کسی ادب پارے [تحقیق و تنقید وغیرہ کے امتیاز سے قطع نظر] سے یوں تحریک پاتا ہے کہ تخلیقی تقاضوں کے عین مطابق ترجمہ اس

کا جذباتی وفکری تجربہ بن کر، کسی فن پارے کو پرائی زبان سے اپنی زبان میں ڈھالنے پر، اسے مجبور کر دیتا ہے۔ ایک ترجمہ نگار بھی کسی مصنف یا شاعر کی طرح تخلیقی عمل ہی سے گزرتا ہے، اگرچہ اس عمل کی نوعیت ثانوی ہوتی ہے۔ ترجمہ نگار پہلے مرحلے پر کسی ادب پارے کی گرفت میں آتا ہے اور اسی قسم کی بے چینی، اضطراب اور کرب سے دوچار ہوتا ہے، جو ایک تخلیق کار کو فکر اور خیال کے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ اگلے مرحلے میں، جب قلم وقرطاس کا رشتہ جڑتا ہے، تو تخلیقی دباؤ کی طرح ترجمانی کا دباؤ بھی گھٹتا بڑھتا ہے اور ترجمہ بنتا بگڑتا آگے چلتا ہے۔ اس دوران میں: الفاظ، تراکیب، جملے اور فقرے ترجمہ نگار کے ہاتھ سے کبھی پھسلتے ہیں، کبھی مختلف شکلوں میں سامنے آتے ہیں اور جب مترجم کے حسبِ منشا ترجمے میں ڈھل جاتے ہیں، تو اس کے عصبی تناؤ میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور وہ اپنی کامیابی کے احساس سے سرشار ہو کر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ بہ ہر حال اگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو ترجمہ بھی حقیقت میں ترجمہ نگار کے اظہارِ ذات ہی کی ایک صورت ہے۔ ظاہر ہے پیشہ ورانہ اور میکانکی تراجم اس ذیل میں نہیں آتے۔" [۱۰۳]

[۲]

ترجمہ نگار کے ہاں اظہارِ ذات کا قرینہ انکسارِ ذات کے عمل سے پھوٹتا ہے۔ یہ اپنی ذات کو تج دینے، یا بعض صورتوں میں اپنی ذات کی نفی کرنے سے عبارت ہوتا ہے۔ وہ مصنف کے زیرِ اثر رہ کر، اپنے اظہار اور اس کی رعنائی کا آہنگ مرتب کرتا ہے، اس کی بہ راہِ راست پہچان اور شناخت ممکن نہیں ہوتی، وہ مصنف کے حوالے سے اُبھرتا اور گم ہوتا ہے۔ البتہ اگر اس کا ترجمہ تخلیق کے تمام تر داخلی اور خارجی وفور کے آہنگ سے مرتب ہو کر، تخلیقِ نو کے لباس سے مزین ہو جائے، تو پھر اس میں رعنائی اور تازگی کے پھول کھل اٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی اپنے تراجم کے جمالیاتی اسلوب میں ایسے ہی مترجم کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، جن کے ترجمے تخلیقِ نو کی صورت گری کے امین بھی ہیں اور عکاس بھی۔ وہ اصل تخلیق کو ایسی تخلیقی رعنائی عطا کرتے ہیں کہ اس کا داخلی رنگ اور خارجی آہنگ متاثر نہیں ہوتا اور وہ تخلیقِ نو کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے۔ ان کے تراجم میں فکری طرزِ احساس اور فنی ہنروری کے آہنگ اور ان کی جمالیاتی رعنائی کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(۱) ڈاکٹر جالبی مغربی تہذیب اور زبان کے بھی مزاج دان ہیں اور مشرقی تہذیب اور اردو زبان کی

نزاکتوں کا بھی وہ کلی ادراک رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایلیٹ اور دیگر مغربی نقادوں کے مضامین کا ترجمہ کرتے ہوئے، ان کے تہذیبی اور ادبی حسن کو اردو زبان کی جمالیات کا حصہ بنادیا۔ اس طرح وہ اُسلوب اظہار کا بھی ایک نیا آہنگ اور قرینہ دریافت کرنے میں کامگار رہے، کیوں کہ ترجمہ نگاری کا فن جس فنی مہارت اور چابک دستی کا متقضی ہوتا ہے، وہ ہر ترجمہ نگار کو نصیب نہیں ہوتی۔ ترجمہ دراصل دو تہذیبوں کے مابین رابطے کا ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے اس میں دونوں تہذیبوں کی خوشبو اور ان کے متنوع رنگ اپنے اپنے فکری اور جمالیاتی آہنگ کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ ایک تہذیب کے تخلیقی رنگ جب دوسری تہذیب میں اُترتے ہیں، تو ان کی بو باس کو جذب کرنا اور اسے نئی صورت میں متشکل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ کسی بھی تہذیب کی معنوی تہ داری اس وقت تک، دوسری تہذیب پر منکشف نہیں ہوتی، جب تک کہ ترجمہ نگار تخلیق کے باطن میں موجود فکری گہرائی اور اس کے ساتھ ساتھ پھیلتے پھولتے تہذیبی رنگوں کو اپنے ترجمے کے باطن میں سمو نہ دے۔ اسی طرح کسی زبان میں جملے کی ساخت اور اس کا انداز اپنی تہذیب کے صداقتِ احساس سے پھوٹتا ہے اور یوں جملہ اسلوبیاتی سطح پر ایک ایسے رنگ رس سے مملو ہو جاتا ہے، جو تہذیبی زندگی کے متنوع رنگوں کا نقیب بھی ہوتا ہے اور اس کے اسالیبی امکانات کا آئینہ دار بھی۔ ایک تخلیق کے تخلیقی تناظر میں دراصل پوری تہذیب ایک ترجمہ نگار کو اپنے جمالیاتی آہنگ سے متاثر کرتی ہے۔ وہ اس تخلیقی سچائی کے بطون میں سفر آشنا رہتے ہوئے اس کا تانا بانا اپنی تہذیب اور اس کے اسلوبیاتی نظام سے وابستہ کر دیتا ہے اور یوں وہ تخلیق کے معنوی امکانات کو اپنی زبان کے اسالیبی آہنگ میں سمو دیتا ہے، اس طرح دو مختلف تہذیبوں کے مابین فکری اور معنوی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایلیٹ کے مضامین اور ارسطو سے ایلیٹ تک میں انھوں نے مختلف مزاج کے نقادوں کے اہم مضامین کا ترجمہ تخلیقی آہنگ سے مکمل کیا۔ ان کے ہاں جذبوں کی صداقت: تہذیب کی تخلیقی کروٹوں کی رعنائی سے ممکن ہوتی ہے۔ وہ جب فکری رویوں کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں، تو نہ صرف تخلیقی جمالیات ان کے ترجمے میں آشکار ہوتی ہے، بل کہ مصنف کا لہجہ اور اس کا اسلوبیاتی آہنگ بھی ترجمے کے آنگن میں اُتر آتا ہے:

> ”ترجمے کا کام یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ اس میں مترجم: مصنف کی شخصیت، فکر اور اُسلوب سے بندھا ہوتا ہے۔ ایک طرف اس زبان کا کلچر، جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے، اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسری طرف اس زبان کا کلچر، جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مترجم کو دونوں کا وفادار رہنا پڑتا ہے۔ یہ دوئی خود مترجم کی شخصیت کو توڑ دیتی ہے، لیکن یہ تو ہر مترجم کا مقدر ہے۔ اس دوئی سے، اسلوب کی سطح پر، خصوصیت کے ساتھ اس زبان کو فائدہ

پہنچتا ہے، جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔اس زبان میں نئے اسالیب کے بہت
سے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔اردو جملے پر تقریباً ڈیڑھ سو سال سے انگریزی
زبان کے جملوں اور اسالیب کا گہرا اثر پڑ رہا ہے۔اسالیب کی یہ تبدیلی دراصل
کلچر کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ایک زبان کا جملہ جب دوسری زبان میں جم کر
ترجمہ ہو جائے،تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ 'دو کلچروں' کا وصل ہو گیا ہے۔" [۱۰۴]

(۲) ڈاکٹر جالبی اپنے ترجموں میں جملے کی ایک ایسی ساخت وضع کرنے میں کامیاب رہے ہیں، جو انگریزی زبان کے لسانی مزاج کو اپنے لسانی پیکر میں سمونے کی اہلیت رکھتی ہے۔وہ لہجے کے متنوع رنگوں کو اپنے جملے کی ساخت کے آہنگ میں اس طرح منعکس کرتے ہیں کہ انگریزی جملوں کے بین السطور لسانی جمالیات کے جتنے رنگ موجود ہوتے ہیں، وہ اپنی تمام تر تہ داری کے ساتھ اردو زبان میں منکشف ہو جاتے ہیں۔اس طرح مغربی تہذیب کا جمالیاتی اور فکری آہنگ ان کے ترجموں کی بدولت اردو زبان کے تہذیبی اور معنوی نظام کے ساتھ ڈھل کر ایک ایسی امتزاجی اکائی کو جنم دیتا ہے، جو دونوں تہذیبوں کے فکری اور لسانی رابطے سے عبارت ہوتا ہے، کیوں کہ ترجمہ: اگر تخلیقی آہنگ سے مملو ہو جائیں، تو پھر زبانوں کے درمیان ایک ایسا فکری رشتہ استوار ہو جاتا ہے، جو ان کے اسالیبی امکانات کو ایک دوسرے کے مابین قربت کا آئینہ دار بنا دیتا ہے۔مصنف کے لہجے کے رنگوں کو تراجم کے تناظر میں منعکس کرنا دراصل ترجمہ نگار کا اپنی زبان اور اس کے اسالیب کو وسعت آشنا کرنا ہے۔

ترجمہ نگاری کا فن جہاں کسی تہذیب کو فکری اور معنوی رعنائی سے ہم کنار کرتا ہے، وہیں اس تہذیب کی زبان کو بیان اور اُسلوب کے نئے سانچے بھی عطا کرتا ہے اور وہ زبان ان سانچوں کی بدولت نئے امکانات سے مملو ہو جاتی ہے۔اس میں ادبی زبان کے رنگ بھی اترتے ہیں اور علمی نیرنگی بھی اپنے حقائق آشکار کرتی ہے۔ترجمے کے یہ تخلیقی رنگ ڈاکٹر جالبی کے تراجم میں اپنی پوری معنویت کے ساتھ کھلتے ہیں۔وہ جس انداز سے مصنف کے لہجے اور اس کی کھنک کو جملے میں منعکس کرتے ہیں، اس سے ترجمے کی شان بڑھ جاتی ہے۔

(۳) ڈاکٹر جالبی کے ترجمے تخلیقِ نو کے رنگ اور آہنگ سے عبارت ہیں۔انھوں نے تخلیق کے متن میں موجود تخلیقی اور جمالیاتی رنگ رس کو اپنی زبان کے لسانی مزاج سے ہم آہنگ کرنے کا جتن کیا، تو تخلیق: ترجمے کے لباس میں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ متشکل ہوئی اور اس طرح ترجمہ: تکنیکی اور میکانکی عمل کی رنگ آمیزی سے محفوظ رہا۔تخلیقی صداقتِ احساس ترجمے میں ڈھل کر اپنے کلچر کی رنگا رنگی کی ترجمان بن گئی اور اس میں ایک ایسا شعور بیدار ہوا کہ جو اس کے رنگ و آہنگ کی کوملتا سے رچا ہوا ہے۔

(۴) یہ ترجمے ڈاکٹر جالبی کے ہاں ایک نئے علمی اُسلوب اور روشنی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ان سے ایک ایسا زاویۂ نظر پیدا ہوتا ہے، جو متوازن اور بصیرت افروز رویوں کا غماز بن جاتا ہے۔ خاص طور پر ایلیٹ کے مضامین کے تراجم میں انھوں نے بین السطور روشنی کی اس ترنگ کو عکس انداز کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ احمد ندیم قاسمی نے لکھا کہ:

''ان مضامین میں سے بعض کے تراجم اس سے پہلے بھی اردو میں ہو چکے ہیں، مگر جمیل جالبی کا ترجمہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ معلوم ہوتا ہے، مغرب کے ان اکابر نے اپنے یہ مضامین لکھے ہی اردو میں ہیں''۔ [۱۰۵]

ڈاکٹر جالبی کے یہ تراجم ان کے وسیع مطالعے، عمیق نظری اور جانکاہ محنت کے عکاس ہیں۔ انھوں نے رواروی میں یہ ترجمے نہیں کیے، بل کہ ان میں ایک ایسے نقطۂ اتصال کی تخلیق کی کہ جہاں دو مختلف تہذیبیں باہم معانقہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر جالبی نے جن شاہ پاروں کے ترجمے کیے، ان کا انتخاب بھی ان کی رعنائیِ فکر اور حسنِ خیال کے جمالیاتی اور فکری اُسلوب کا ترجمان ہے۔ انتخاب کے باب میں ان کا حسنِ اُسلوب ان کے فکری معاملات کی نقاب کشائی کرتا ہے، تو اس میں ان کے ذہنی اور فکری رویے بھی منعکس ہوتے ہیں۔ غالب نے دل کے معاملات کھلنے اور آشکار ہونے کو رسوائی کے مترادف گردانا تھا، لیکن فکری اور معنوی آہنگ کی خوش نمائی کسی بھی شخصیت اور تہذیب کی باطنی گہرائی اور پھیلاؤ سے عبارت ہوتی ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی رقم طراز ہیں کہ:

''ترجمے کے معاملے میں ڈاکٹر جمیل سب سے پہلے اپنے موضوعات کے انتخاب کے لیے تعریف کے مستحق ہیں۔ اگر بیسویں صدی کے کسی ایک مغربی نقاد کی تحریروں کو ترجمے کے لیے منتخب کرنے کا فیصلہ کیا جائے، تو مجھے یقین ہے کہ وہ فیصلہ اگر سو فی صد نہیں، تو بھاری اکثریت کے ساتھ ٹی ایس ایلیٹ ہی کے حق میں ہوگا۔ ویسے اگر ایلیٹ سے کم تر درجے کے بھی کسی نقاد کی تحریروں کا ترجمہ اردو میں کر دیا جاتا، تو اس سے بھی اردو ادب کو بڑا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ مثلاً: اردو میں کوئی ایف آر لیوس یا ایڈمنڈ ولسن یا نارتھروپ فرائی بھی کہاں ہے۔ بہ ہر حال یہ اردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ بیسویں صدی کے مغربی نقادوں میں ڈاکٹر جمیل کی دل چسپی کا مرکز ٹی ایس ایلیٹ بنا، جو اپنی شاعری اور تنقید دونوں کے اعتبار سے عہد حاضر میں سب سے بڑے عالمی اثر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ممکن ہے ییٹس اور ایذرا پاؤنڈ

بہت سوں کے نزدیک ایلیٹ سے عظیم تر شاعر ہوں، لیکن آج کی دنیا میں عالمی شاعری پر جتنا اثر ایلیٹ کا رہا ہے، اتنا ییٹس اور پاؤنڈ کا ہرگز نہیں رہا۔ یہی حال ایلیٹ کے ناقدانہ اثرات کا ہے۔ ایلیٹ کے تنقیدی نظریات سے شدید اختلافات کا سلسلہ ایک مدت سے چل رہا ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ایلیٹ کے متنازع فیہ نظریات نے بھی بیسویں صدی کے عالمی ادب کو جس حد تک متاثر کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔" [۱۰۶]

(۵) مختلف اور متنوع تراجم ڈاکٹر صاحب کے فکری اور معنوی پہلوؤں کے آئینہ دار بھی ہیں اور ان کی لسانی مہارت کے عکاس بھی۔ وہ مصنف کے زاویۂ نظر اور اسلوبِ نگارش کی رعنائی اور احساس کو ترجمے کے لباس سے مزین کرکے، اپنی زبان اور اس کے اُسلوب، لفظیات اور لہجے کے آہنگ اور لحن کو وسعت آشنا کرتے ہیں۔ وہ ترجمے کے لیے جن تخلیقات کا انتخاب کرتے ہیں، ان میں ان کی ذات اور فکر کے متنوع رنگ بھی جلوہ گر ہوتے ہیں اور اُسلوب کا آہنگ دو لکھنے والوں کے فکری اور معنوی اشتراک اور اجتماعی سطح پر دو تہذیبوں کے امتزاج کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں مترجم کے ذہنی اور فکری رویے بھی ملتے ہیں اور بہ قولِ غالب: دل کے معاملات بھی کھلتے اور اظہار کی راہ پاتے ہیں۔ ترجمہ نگاری سے جہاں ترجمہ نگار کے مطالعاتی اُسلوب میں رعنائی اور حسنِ خیال میں رنگینی کے در وا ہوتے ہیں، وہیں زبان و بیان میں گہرائی اور گیرائی کے زاویے بھی متشکل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کے ترجموں میں، تہذیبی اقدار اور ان کے معنوی آہنگ کا رچاؤ بھی ملتا ہے اور معیار کی جلوہ آرائی بھی۔ وہ ترجمے میں اصل تخلیق کے اُسلوب سے اس میں درج خیالات کی گہرائی کا پتا لگاتے ہیں، تو مصنف کا لہجہ اور اس کی جمالیات بھی ان کے ترجمے کے سانچے میں اُتر آتی ہیں۔

(۶) ڈاکٹر جالبی نے انگریزی زبان کے اُسلوب میں اپنی زبان کے اظہار کا بالکل نیا قرینہ اور تازہ اُسلوب دریافت کیا۔ اس میں فنی وسعت بھی ہے اور فکری گہرائی بھی۔ یہ طرزِ احساس کی رنگینی اور خیال کی رعنائی کا اشاریہ ہے۔ اگر ان تہذیبوں میں فکری اور معنوی بعد ہو، تو ایک میں دوسری کے تہذیبی رنگ اُبھارنا خاصا مشکل ہوتا ہے، کیوں کہ فکری اور جمالیاتی ہم آہنگی نہ ہونے کی صورت میں ان کے مابین مکالماتی آہنگ کو پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر ترجمے کو میکانکی عمل سے بچا کر اسے تخلیقی رنگ سے مملو کرنا اور تخلیق کے باطن میں موجود تمام تر رنگوں کی عکاسی کرنا ایک ایسے مترجم کا کام ہے، جو تخلیقی کروٹوں اور تہذیبی رنگوں کی آمیزش سے اپنے جمالیاتی اُسلوب کو ہم آہنگ رکھنے کے ہنر سے آگاہ ہو۔ صرف اسی صورت میں ترجمہ تخلیقِ نو کے لباس میں، ملبوس ہوسکتا ہے کہ جب ترجمہ نگار اس کے فکری اور جمالیاتی رنگوں کو تہذیبی صداقت اور اس کے طرزِ احساس سے ہم آہنگ رکھنے کا جتن کرسکے۔ بہ صورتِ دیگر تخلیقی

رعنائی: تکنیکی اور میکانکی ترجمے میں کہیں گم ہو کر رہ جائے گی اور اس کا اُسلوب اپنے تہذیبی اور فکری محاسن کی عکس گری سے محروم رہے گا۔

(۷) ڈاکٹر جالبی نے مصنف کے اُسلوب، اس کے معنوی آہنگ اور تخلیق کے بین السطور موجود جمالیاتی احساس اور لہجے کی کھنک اور اس کے بانکپن کو تراجم میں سمونے اور محفوظ رکھنے کا جتن کیا۔ اس طرح مصنف کی روح بھی باقی رہی اور اس کا اُسلوبیاتی طرزِ اظہار بھی اور ترجمے میں ترجمہ نگار کی بصیرت افروزی اور مہارتِ فن کا رنگ بھی نمایاں ہوا۔ زبان کا لسانی مزاج بھی وسعت آشنا ہوا اور لفظ کے نئے 'Shades' بھی معنوی رنگارنگی سے مملو ہوئے، کیوں کہ ترجمہ نگاری: فکری نظام اور لسانی مزاج کی وسعت آشنائی سے عبارت ہوتی ہے۔ فکری آہنگ ایک پوری تہذیب کی روح کی انعکاس پذیری سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور لسانی مزاج: زبان کو نئے آہنگ سے مربوط کرتا ہے۔ اس طرح فکری اور لسانی سطح پر ایک ایسا زاویۂ نظر سامنے آتا ہے، جو فکر و فرہنگ کے تہ در تہ آفاق کے پھیلتے منظر ناموں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

[۳]

ترجمہ: زبان کے لسانی مزاج کو ہمہ رنگی اور ہمہ گیری کے اُسلوب اور لہجے سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس سے زبان میں رعنائی پیدا ہوتی ہے، روانی اور آہنگ بھی۔ ترجمہ چوں کہ زبان کے پیٹرن کو نئے رنگوں اور نئے لہجوں میں دریافت کرتا ہے، اس لیے اس سے جملے کی ساخت اور بیان کا نیا پیرایہ متشکل ہوتا ہے۔ لفظیات میں معنوی وسعت پیدا ہوتی ہے، تو لہجے میں اظہار کی قوت نئے امکانات پیدا کرتی ہے۔ اس طرح زبان کا آہنگ اور قوتِ اظہار کی رعنائی دوسری تہذیب کے بدلتے رنگوں اور موسموں کی تصویر کشی میں معاون ہوتی ہے۔ ترجمہ جہاں ایک طرف نئے خیالات اور فکری نظام کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتا ہے، وہیں دوسری طرف اظہار اور اُسلوب کے قرینوں کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کرتا ہے۔ اس میں طرزِ احساس کی جمالیات کے رنگ رس ڈھلتے ہیں، تو امکانات کی نئی دنیا پیدا ہوتی ہے۔ مصنف کا لہجہ اور اندازِ بیان ترجمے کے آئینے میں عکس اندازی کرتا ہے اور جملوں کے اندر موجود معنوی، فنی اور جمالیاتی رنگارنگی اگر ترجمے کے آنگن میں اتر آئے، تو ترجمہ نگار اپنے ترجمے میں کامگار ٹھہرتا ہے۔ بہ صورتِ دیگر ترجمہ میکانکی عمل بن کر رہ جاتا ہے:

> ''ایسے میں مترجم کا یہ فرض ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرزِ ادا کا خیال رکھے۔
> لفظوں کا ترجمہ قریب قریب معنی ادا کرنے والے الفاظ میں نہ کرے اور
> ضرورت پڑنے پر نئے مرکب بنائے؛ نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ وضع

کرے۔ ایسے ترجمے سے آخر کیا فائدہ، جو سلاست و روانی تو پیدا کر دے، لیکن مصنف کی روح؛ اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے اور ساتھ ساتھ زبان کے مزاج کو اسی طرح روایتی روش اور اظہارِ بیان پر قائم رکھے اور اس میں کسی اضافے، اسلوب کے نئے امکان یا بیان کے نئے تجربے کی کوشش نہ کرے۔ میرے سامنے ترجمے کا معیار یہ رہا ہے کہ اگر ترجمے کو دو ایسے آدمیوں کو دکھایا جائے، جن میں سے ایک اس زبان سے، جس کا ترجمہ کیا گیا ہے، اچھی واقفیت رکھتا ہو، اور دوسرا اس زبان سے گہری دل چسپی اور واقفیت رکھتا ہو اور پہلا، ترجمے کو دیکھ کر یہ کہے کہ: بات تو خوب ہے، اصل مصنف کون ہے؟ اور دوسرا یہ کہے کہ: مصنف تو یقیناً مسٹر ایلیٹ ہیں، لیکن یہ یاد نہیں پڑتا کہ یہ حصہ ان کے کس مضمون یا تحریر کا ترجمہ ہے، تو میں اسے ترجمے کی کامیابی سمجھوں گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مترجم نے مصنف کے طرزِ بیان، اس کے لہجے اور مزاج کو اس حد تک باقی رکھا ہے کہ خود ترجمے میں اصل مصنف کی روح بول رہی ہے اور یہی وہ چیز ہے، جو میرے خیال میں ہر اچھے ترجمے میں ہونی چاہیے۔'' [۱۰۷]

حوالہ جات

۱۔ کچھ جمیل جالبی کے بارے میں از ڈاکٹر خلیق انجم مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی	دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: بار اوّل ۱۹۹۳ء	ص ۱۹
۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سے گفتگو: ڈاکٹر مشرف احمد: سہ ماہی ارمغان [جمیل جالبی نمبر]	کراچی: اپریل مئی جون ۱۹۹۶ء	ص ۱۵۴
۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سے مکالمہ: روز نامہ نوائے وقت	اسلام آباد: ۱۱ جنوری ۲۰۰۵ء	
۴۔ راقم الحروف سے گفتگو	بہ مقام رائٹرز ہاؤس، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد: ۱۴ دسمبر ۲۰۰۶ء	
۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا بچپن (انٹرویو): محمد فہیم غازی: ماہ نامہ ٹوٹ بٹوٹ	کراچی: مئی ۱۹۸۴ء	ص ۶۷
۶۔ فیملی فیچر از صوفیہ یزدانی: ہفت روزہ فیملی میگزین	کراچی: ۲ تا ۸ جنوری ۲۰۰۰ء	ص ۲۲
۷۔ محولہ بالا		ص: ۲۲

۸۔ راقم الحروف سے گفتگو — بہ مقام رائٹرز ہاؤس، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد: ۱۴ دسمبر ۲۰۰۶ء

۹۔ محولہ بالا

۱۰۔ محولہ بالا

۱۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... سوانحی کتابیات مرتبہ ڈاکٹر نسیم فاطمہ بہ اشتراک سعید احمد۔ لاہور، الفیصل تاجران و ناشرانِ کتب: ۱۹۹۶ء ص ۳۱

۱۲۔ ہفت روزہ فیملی میگزین — کراچی — ص: ۲۲

۱۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... سوانحی کتابیات — ص ۳۱

۱۴۔ یہ اسمائے گرامی ڈاکٹر جمیل جالبی کے مختلف مکالموں اور ان کے بارے میں لکھے گئے شخصی مضامین سے اخذ کیے گئے۔

۱۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... سوانحی کتابیات — ص ۳۱

۱۶۔ ایضاً — ص ۳۱

۱۷۔ ایضاً — ص ۳۱

۱۸۔ سہ ماہی سفیرِ اردو [جمیل جالبی نمبر] — لیوٹن: اکتوبر نومبر دسمبر ۲۰۰۴ء — ص ۲

۱۹۔ انٹرویو: شاہد شفیق: روزنامہ جنگ — کراچی: ۲۸ جون ۱۹۹۵ء

۲۰۔ ارمغان — ص ۱۶۸

۲۱۔ ارمغان — ص ۱۶۸

۲۲۔ روشنی سراپا مشمولہ ارمغان — ص ۳۰-۳۱

۲۳۔ جالبی صاحب مشمولہ ارمغان — ص ۵۵

۲۴۔ میرا ہم جماعت: انور عالم صدیقی مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ — ص ۳۴

۲۵۔ جمیل جالبی: شاہد احمد دہلوی مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ — ص ۷۷۔۷۸

۲۶۔ جمیل میرے دوست: سلیم احمد مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ — ص ۴۸۔۴۹

۲۷۔ وضع دار آدمی: نصر اللہ خاں: ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ — ص ۱۳۳

۲۸۔ میرا ہم جماعت: انور عالم صدیقی: ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ — ص ۴۶۔۴۷

۲۹ بیگم نسیم شاہین بہ حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے گھر میں (حسین بانو) مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ — ص ۱۴۹

۳۰۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: صادق حسین مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ — ص ۱۰۳۔۱۰۴

۳۱۔ پیش لفظ: نئی تنقید: کراچی، رائل بک کمپنی: بارِ اوّل ۱۹۸۵ء — ص ۱۰

۳۲۔ ایضاً — ص ۱۰۔۱۱

۳۳۔ نئے معنی کی تلاش: نئی تنقید — ص ۲۹۲

۳۴۔ پیش لفظ: نئی تنقید — ص ۱۰

۳۵۔ نئی تنقید کا منصب: نئی تنقید — ص ۴۷

۳۶۔ قومی تشخص اور ثقافت: قومی تشخص اور ثقافت مرتبہ خالد سعید: اسلام آباد، ادارۂ ثقافتِ پاکستان: بارِ اوّل ۱۹۸۴ء — ص ۴۵

۳۷۔ نئی تنقید کا منصب: نئی تنقید — ص ۴۸

۳۸۔ ایضاً — ص ۴۷

۳۹۔ ایضاً — ص ۴۷

۴۰۔ تنقید اور جدید اردو تنقید — کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: بارِ اوّل ۱۹۸۹ء — ص ۲۴۱۔۲۴۲

۴۱۔ ارسطو سے ایلیٹ تک: سہ ماہی ارمغان — ص ۷۵

۴۲۔ رائے مشمولہ تنقید اور تجربہ — لاہور، یونیورسل بکس: بارِ دوم ۱۹۸۸ء

۴۳۔ ادب یا مابعد الادب: تنقید اور تجربہ — ص ۲۶

۴۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا تصورِ ادب و کلچر: سہ ماہی ارمغان — ص ۱۲۷

۴۵۔ رائے مشمولہ تنقید اور تجربہ

۴۶۔ جمیل جالبی کی تنقید مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی .... ایک مطالعہ — ص ۱۵۸

۴۷۔ پاکستانی کلچر .... قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ — کراچی، مشتاق بک ڈپو: بارِ اوّل ۱۹۶۴ء — ص ۱۱۱

۴۸۔ پاکستانی کلچر ..... ایک زاویہ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی .... ایک مطالعہ — ص ۳۸۷

۴۹۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ..... اسلوب کی باتیں مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ..... ایک مطالعہ — ص ۱۷۴

۵۰۔ محمد تقی میر — کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: بارِ اوّل ۱۹۸۱ء — ص ۱۲۵

۵۱۔ طرزِ غالب: نئی تنقید — ص ۲۱۶

۵۲۔ شاعری اور مسائلِ حیات: معاصر ادب — لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز: بارِ اوّل ۱۹۹۱ء — ص ۳۰۔۳۱

۵۳۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ....ایک مطالعہ ص۲۰۵

۵۴۔ رائے مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ ص۱۳۵

۵۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا اندازِ تحقیق مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی............ایک مطالعہ ص۲۳۵

۵۶۔ *تاریخِ ادبِ اردو* [جلد اوّل] لاہور، مجلس ترقی ادب: بارِ دوم ۱۹۸۴ء ص ز

۵۷۔ اردو ادب کی پہلی تاریخ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ....ایک مطالعہ ص۲۲۹

۵۸۔ *تاریخِ ادبِ اردو* [جلد اوّل] ص۲

۵۹۔ ایضاً ص۹

۶۰۔ اردو ادب کی پہلی تاریخ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی............ ایک مطالعہ ص۳۰۴

۶۱۔ پاکستانی کلچر اور تاریخِ ادبِ اردو: سہ ماہی ارمغان ص۸۳

۶۲۔ تاریخِ ادبِ اردو [جلد اوّل] ص۱۔۲

۶۳۔ ایضاً ص:ح

۶۴۔ ایضاً ص:ح

۶۵۔ جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو مشمولہ ارمغان ص۷۶۔۷۷

٦٦۔ تاریخِ ادبِ اردو کا ایک جائزہ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی.....ایک مطالعہ — ص۳۱۲

٦٧۔ تاریخِ ادبِ اردو کی پہلی تاریخ: ایضاً — ص۳۰۸

٦٨۔ ڈاکٹر جمیل جالبی..... اسلوب کی باتیں: ایضاً — ص۱۷۵۔۱۷۶

٦٩۔ تاریخِ ادبِ اردو [جلد اوّل] — ص ۵۵۰۔۵۵۱

٧٠۔ ایضاً — ص۹۲

٧١۔ ایضاً — ص ۵۶۸۔۵۶۹

٧٢۔ اردو ادب کی پہلی تاریخ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی .....ایک مطالعہ — ص۳۱۰

٧٣۔ تحقیق کے جدید رجحانات مشمولہ ادبی تحقیق — لاہور، مجلسِ ترقی ادب: بار اوّل ۱۹۹۴ء — ص۱۱

٧٤۔ ایضاً — ص۱۲

٧٥۔ اردو تحقیق کی روایت ...... ایک مصاحبہ: ایضاً — ص۲۸

٧٦۔ نکات الشعرا کا تحقیقی مطالعہ: ایضاً — ص۳۰۰

٧٧۔ اردو تحقیق کی روایت ...... ایک مصاحبہ: ایضاً — ص۲۲۔۲۳

٧٨۔ دسویں صدی ہجری میں اردو شاعری کی روایت مشمولہ ادبی تحقیق — ص۱۹۳۔۱۹۴

۷۹۔ دیوانِ حسن شوقی از افسر صدیقی امروہوی مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی......ایک مطالعہ		ص۲۶۱
۸۰۔ دیوانِ حسن شوقی	کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: بارِ اوّل ۱۹۷۱ء	ص۴۹
۸۱۔ ایضاً		ص۴۷_۴۸
۸۲۔ دیوانِ حسن شوقی مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی......ایک مطالعہ		ص۶۳_۲۶۲
۸۳۔ دیوانِ نصرتی	لاہور، قوسین: بارِ اوّل ۱۹۷۲ء	ص۱۵_۱۶
۸۴۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی...... ایک مطالعہ		ص۲۴۸
۸۵۔ ایضاً		ص۲۴۹
۸۶۔ مثنوی نظامی دکنی المعروف به مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: بارِ اوّل ۱۹۷۳ء	ص۹
۸۷۔ ایضاً		ص۱۰
۸۸۔ ایضاً		ص۱۰_۱۱
۸۹۔ ایضاً		ص۳۵_۳۶
۹۰۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی...... ایک مطالعہ		ص۲۵۵
۹۱۔ اردو تحقیق کی روایت......ایک مصاحبہ مشمولہ ادبی تحقیق		ص۳۶
۹۲۔ قدیم اردو کی لغت	لاہور، مرکزی اردو بورڈ: بارِ اوّل ۱۹۷۳ء	ص۱۱
۹۳۔ قدیم اردو کی لغت مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی...... ایک مطالعہ		ص۴۲۳
۹۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق مشمولہ سہ ماہی ارمغان		ص۱۱۴_۱۱۵

۹۵۔ قدیم اردو کی لغت مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی.......... ایک مطالعہ		ص ۴۲۴
۹۶۔ قومی انگریزی اردو لغت	اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: بارِ پنجم ۲۰۰۲ء	ص ۶
۹۷۔ ایضاً		ص ۶۔۷
۹۸۔ ایضاً		ص ۵
۹۹۔ قومی انگریزی اردو لغت کی تدوین اور ڈاکٹر جمیل جالبی مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی.......... ایک مطالعہ		ص ۴۳۳
۱۰۰۔ فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ [جلد اوّل]	اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: بارِ اوّل ۱۹۹۱ء	ص الف
۱۰۱۔ ایضاً		ص ب
۱۰۲۔ وضعِ اصطلاحات	کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: ۱۹۶۵ء	ص ۱۲
۱۰۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور ٹی ایس ایلیٹ مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی .....ایک مطالعہ		ص ۲۱۳۔۲۱۴
۱۰۴۔ ارسطو سے ایلیٹ تک	اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن: بارِ ہفتم ۲۰۰۳ء	ص ۱۳
۱۰۵۔ ارسطو سے ایلیٹ تک مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی............ایک مطالعہ		ص ۴۱۸
۱۰۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ..... ایک ممتاز مترجم: ایضاً		ص ۳۹۹
۱۰۷۔ ترجمے کے مسائل: تنقید اور تجربہ		ص ۱۰۸۔۱۰۹

حواشی

☆۱ "ٹی ایس ایلیٹ کو ترجمہ کرنے کا سبب بھی یہی تھا کہ میں اس کے تنقیدی اسلوب کو اپنانا چاہتا تھا اور ترجمے سے میں نے اس کے اسلوبی راز کو دریافت کر کے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، میری تحریر پر ایلیٹ کا اثر نمایاں ہے۔"

[ڈاکٹر جمیل جالبی سے گفتگو: شیراز بن عطا: وژن مجلہ اسلام آباد ماڈل کالج، ایف ۱۰/۴، اسلام آباد: ۲۰۰۶ء: ص ۱۸]

☆۲ ڈاکٹر عطش درانی نے لکھا:

"اردو میں ذولسانی لغات کی تدوین کی تاریخ چار سو سال سے زائد ہو چکی ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق پہلا انگریزی اردو لغت ۱۵۹۵ء کا ہے، جو سورت کی بندرگاہ پر ایک پرتگالی نے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد جارج ہیڈلے، فوربز اور فیلن جیسے مستشرقین نے بھی انگریزی اردو لغت مرتب کیے۔ [قومی انگریزی اردو لغت کی تدوین اور ڈاکٹر جمیل جالبی مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی ....ایک مطالعہ: ص ۴۲۹]

کتابیات

بنیادی مآخذ

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ادبی تحقیق: لاہور، مجلسِ ترقی ادب: بارِ اوّل ۱۹۹۴ء

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ارسطو سے ایلیٹ تک: اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن: بارِ ہفتم ۲۰۰۳ء

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: پاکستانی کلچر .... قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ: کراچی، مشتاق بک ڈپو: بارِ اوّل ۱۹۶۴ء

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخِ ادبِ اردو [جلد اوّل]: لاہور، مجلسِ ترقی ادب: بارِ دوم ۱۹۸۴ء

۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تنقید اور تجربہ: لاہور، یونیورسل بکس: بارِ دوم: ۱۹۸۸ء

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: دیوانِ حسن شوقی: کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: بارِ اوّل ۱۹۷۱ء

۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: دیوانِ نصرتی: لاہور، قوسین: بارِ اوّل ۱۹۷۲ء

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ [جلد اوّل]: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: بارِ اوّل ۱۹۹۱ء

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: قدیم اردو کی لغت: لاہور، مرکزی اردو بورڈ: بارِ اوّل ۱۹۷۳ء

۱۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: قومی انگریزی اردو لغت: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: بارِ پنجم ۲۰۰۲ء

۱۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ: کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: بارِ اوّل ۱۹۷۳ء

۱۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: محمد تقی میر: کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: بارِ اوّل ۱۹۸۱ء

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: معاصر ادب: لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز: بارِ اوّل ۱۹۹۱ء

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: نئی تنقید: کراچی، رائل بک کمپنی: بارِاوّل ۱۹۸۵ء

ثانوی مآخذ

۱۵۔ خالد سعید [مرتب]: قومی تشخص اور ثقافت: اسلام آباد، ادارۂ ثقافتِ پاکستان: بارِاوّل ۱۹۸۳ء

۱۶۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ڈاکٹر جمیل جالبی ...... ایک مطالعہ: دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس: بارِاوّل ۱۹۹۳ء

۱۷۔ نسیم فاطمہ، ڈاکٹر بہ اشتراک سعید احمد: ڈاکٹر جمیل جالبی..... سوانحی کتابیات: لاہور، الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب: ۱۹۹۶ء

۱۸۔ وحید الدین سلیم، مولانا: وضع اصطلاحات: کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: ۱۹۶۵ء

۱۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: تنقید اور جدید اردو تنقید: کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان: بارِاوّل ۱۹۸۹ء

رسائل و اخبارات

۱۔ روزنامہ جنگ، کراچی: ۲۸ جون ۱۹۹۵ء

۲۔ روزنامہ نوائے وقت، اسلام آباد: ۱۱ جنوری ۲۰۰۵ء

۳۔ ہفت روزہ فیملی میگزین، کراچی: ۲ تا ۸ جنوری ۲۰۰۰ء

۴۔ ماہ نامہ ٹوٹ بٹوٹ، کراچی: مئی ۱۹۸۴ء

۵۔ سہ ماہی ارمغان [جمیل جالبی نمبر]، کراچی: اپریل مئی جون ۱۹۹۶ء

۶۔ سہ ماہی سفیرِ اردو [جمیل جالبی نمبر]، لیوٹن: اکتوبر نومبر دسمبر ۲۰۰۴ء

۷۔ وژن مجلّہ اسلام آباد ماڈل کالج، اسلام آباد ایف۔۷/۲: ۲۰۰۶ء

ملاقات

راقم الحروف سے گفتگو: بہ مقام رائٹرز ہاؤس، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد: ۱۴ دسمبر ۲۰۰۶ء